# اسلام اور دیگر تہذیبیں

## پرامن بقائے باہم کا آفاقی اور کائناتی تصور

تحریر

**ڈاکٹر طہ جابر علوانی**

ایفا پبلیکیشنز، نئی دھلی

جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ


| | | |
|---|---|---|
| نام کتاب | : | اسلام اور دیگر تہذیبیں<br>پرامن بقائے باہم کا آفاقی اور کائناتی تصور |
| مصنف | : | ڈاکٹر طہٰ جابر علوانی |
| مترجم | : | مولانا ہشام الحق ندوی |
| صفحات | : | ۱۰۰ |
| اشاعت اول | : | مئی ۲۰۰۴ء |
| اشاعت دوم | : | جون ۲۰۱۰ء |
| قیمت | : | ۵۰/روپے |

ناشر

**ایفا پبلیکیشنز**

۱۶۱-ایف، بیسمنٹ، جوگابائی، جامعہ نگر، نئی دہلی-۲۵

فون: 011-26983728, 26981327

ای میل lfapublication@gmail.com

# فہرست عنوانات


| نمبر شمار | عناوین | صفحہ نمبر |
|---|---|---|
| | اسلام اور پر امن بقائے باہم | ۵ |
| ۱- | نبوت اور خلافت | ۵ |
| ۲- | انسانیت-خصوصیات اور عالم گیریتوں کے درمیان | ۶ |
| ۳- | ختم نبوت | ۸ |
| ۴- | بعثت کے وقت روئے زمین کی صورت حال | ۱۱ |
| ۵- | دارالاسلام اور دارالحرب | ۲۲ |
| ۶- | اسلام کی عالم گیریت | ۲۴ |
| ۷- | اسلام سے پہلے بین الاقوامی تعلقات | ۲۴ |
| ۸- | مغربی تسلط | ۳۲ |
| ۹- | انسانوں کی درجہ بندی میں انسانی اور سماجی علوم کا کردار | ۳۴ |
| ۱۰- | عالم گیریت کا اسلامی تصور | ۳۵ |
| ۱۱- | ہدایت اور حق کی عالم گیریت | ۳۸ |
| ۱۲- | اسلامی سطح پر عالم گیریت کی راہ کی رکاوٹیں | ۴۳ |
| ۱۳- | مغرب کی سطح پر عالم گیریت کی راہ کی رکاوٹیں | ۴۵ |

| | | |
|---|---|---|
| ۱۴- | عالم گیریت اور مسائل | ۴۸ |
| ۱۵- | پورے طور پر اسلام میں داخل ہونے کا اصول | ۵۶ |
| ۱۶- | کش مکش اور باہمی عداوت | ۶۷ |
| ۱۷- | کیا فقہ کا بھی کوئی کردار ہے؟ | ۷۸ |
| ۱۸- | مختلف مسائل کا باہمی ربط | ۸۱ |
| ۱۹- | منہجی فہم اور نص اور کائنات کا جامع مطالعہ | ۸۸ |
| ۲۰- | قرآن کی منہجیت | ۹۵ |
| ۲۱- | اجتماعی اجتہاد اور اجتماعی عمل | ۹۶ |
| ۲۲- | تصورات سے متعلق مسائل | ۹۹ |


☆☆☆

# اسلام اور پرامن بقائے باہم

## نبوت اور خلافت:

ابوالانبیاء حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام کے ساتھ اسلام کی آمد کا مقصد اپنے روز اول ہی سے یہ تھا کہ تمام بنی نوع انسان کے درمیان ربط و تعلق کی بنیادیں مضبوط اور مستحکم ہوں، وسعت اور رواداری سے بھرپور ملت اسلامی کے سایہ تلے سب جمع ہوں اور اگر ان کے درمیان افتراق ناگزیر ہی ہو تو اس کی بنیاد کفر و شرک کے رجحانات، ظلم و انحراف کے میلانات، مشترک اعلاقدروں سے غفلت، روئے زمین کی خلاف کے مشن سے دست برداری اور اس عہد کی خلاف ورزی ہو جو مخلوق کی طرف سے "بلی شھدنا" کہے جانے کے وقت خالق اور مخلوق کے درمیان طے پایا تھا۔

انسانوں کے درمیان تفریق اور امتیاز پر ابھارنے والی کوئی چیز نہ تمام انبیاء کے پروگراموں میں تھی اور نہ ان پیغامات میں جن کے وہ حامل تھے، کیونکہ ان پیغامات کی رو سے تمام انسان آدم کی اولاد ہیں اور آدم مٹی سے پیدا کئے گئے تھے، یہ بات درست ہے کہ اللہ تعالی نے فرشتوں اور لوگوں میں سے اپنے پیغام رساں منتخب کئے ہیں، جس طرح اس نے مختلف اقوام کا انتخاب کیا ہے اور انسانوں کو زبان، رنگ، نسل بلکہ مذہب، مسلک اور ماحول کے اعتبار سے مختلف قوموں اور قسموں میں تقسیم کیا ہے، تا کہ وہ ایک دوسرے کو پہچان سکیں، ایک دوسرے سے محبت کریں، اس لئے نہیں کہ وہ باہم اختلاف کریں، ایک دوسرے سے قطع تعلق کریں، دشمنی کریں اور برسر پیکار رہوں بلکہ اس لئے تا کہ وہ نیکی و تقوی کے کاموں میں، اسی طرح اس زمین

کی آبادکاری میں جس کا ان کو خلیفہ بنایا گیا ہے، نیز اس میں امن وسلامتی کے ساتھ رہنے میں، ایک دوسرے کے معاون اور مددگار ہوں۔

## انسانیت-خصوصیات اور عالم گیریتوں کے درمیان:

محمد ﷺ کی بعثت سے قبل انسانیت مختلف ایسے مراحل سے گذری جن کے نتیجہ میں دنیا میں متعدد حکومتوں اور نظاموں کی بنیاد پڑی، قوانین اور شرائع جاری ہوئے، انسان کے تصور حکومت سے واقف ہونے سے پہلے اور اس کے بعد بھی لوگوں کے متنوع تعلقات کو منظم کرنے کی بہت سی کوششیں ہوئیں، لیکن یہ تمام تر کوششیں انسانی آبادی کی مختلف شاخوں، قوموں، قبیلوں، امتوں اور سلطنتوں کو ان کے مشترک سرچشموں کی طرف لوٹانے میں ناکام ثابت ہوئیں، کیونکہ ان کے مفادات ایک دوسرے سے مختلف تھے، ان کے اغراض و مقاصد باہم متصادم، نیز دلچسپیاں متضاد تھیں اور انسان پورے طور پر لوگوں کو اسلام میں داخل کرنے کے لئے موزوں اور مناسب حال تدابیر تک رسائی حاصل کرنے سے قاصر تھا۔

انسانیت ایسے کئی ادوار سے گذری ہے جن میں ''مختلف عالم گیریتوں'' کے تصورات، معیارات اور اصول و مبادیات کی حکمرانی رہی ہے، حیثیین (Hittites)، فراعنہ (Pharaohs)، اہل بائبل (Babylonians)، اسی طرح ہکوس (Hyksos)، سومریوں (Sumerians)، آکادیوں (Akkadians) اور ان کے بعد کے عبرانیوں (Hebrews)، ہیلینیوں (Hellenians) اور رومیوں (Romans) نے تاریخ میں مختلف النوع عالم گیریتیں قائم کرنے کی کوششیں کی ہیں، ان تمام کوششوں میں کائنات، زندگی اور انسان کی فطرت نیز خالق کائنات کی عظیم تر ہستی سے ان تینوں کے ربط و تعلق سے متعلق صاف ستھرے تصور کو نظر انداز کیا گیا تھا اور اپنی ذات کو تقدس کا درجہ عطا کر کے دوسروں کو حقیر گردانے کی کوشش کی گئی تھی، کائنات، انسان اور زندگی کے خالق سے متعلق ایک صاف ستھرے تصور کے

فقدان کی وجہ سے مذکورہ تینوں عناصر کے درمیان ربط وتعلق کمزور پڑ گیا، یہی وجہ ہے کہ انسان ٹھیک طریقہ پر خالقیت اور مخلوقیت کے رشتے نیز تسخیر، ابتلاء اور امانت کی سپردگی سے متعلق مختلف مسائل، اسی طرح تخلیق سے حق تعالی شانہ کی غرض وغایت کو سمجھنے سے قاصر رہا۔ کیونکہ اقوام وملل کے درمیان ''تعارف، الفت اور تعاون کے روابط'' کی تشکیل کے صاف ستھرے اصول و مبادیات مفقود تھے، اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ روئے زمین ان بیشتر ادوار میں جن سے وہ گذری، امن و سلامتی سے نا آشنا رہی اور اس پر امن کا جھنڈا نہیں لہرا سکا یہاں تک کہ انسانیت اس سے مایوس ہوگئی کہ وہ کبھی امن سے مستفید بھی ہو سکے گی اور اس نے یہ خیال کرلیا کہ اقوام کے درمیان کش مکش ایک ثابت شدہ حقیقت ہے، یہی صورت حال برقرار رہی یہاں تک کہ محمد بن عبداللہ ﷺ ایک ایسی مکمل اور آخری رسالت کے ذریعہ مبعوث کئے گئے جس نے سابقہ تمام نبوتوں کے سرمائے پر مہر تصدیق ثبت کردی اور ایسے مکمل اور صاف ستھرے طریقہ پر از سر نو ان کی قدر و قیمت واضح کی جس میں کائنات، انسان اور زندگی نیز خالق کائنات سے ان کے ربط وتعلق سے متعلق ایک جامع نظریہ اور تصور شامل تھا، اس رسالت نے استخلاف، ابتلاء، تسخیر اور امانت کے مضبوط اصول واضح کئے تا کہ اس کے ذریعہ امن کی جڑیں، استحکام کے ستون اور سلامتی کی بنیادیں مضبوط ہوں اور تسلط نیز انسان پر انسان کے تسلط کے تمام ذرائع کا کلی طور پر خاتمہ کر کے آزادی واستقلال کی بنیادیں مستحکم کی جائیں اور الوہیت کو صرف اور صرف اللہ رب العزت ہی کی ذات تک اس طرح محدود کر دیا جائے کہ عبادت واطاعت اور یکسوئی کی تمام صورتیں اسی کے لئے خاص کردی جائیں۔ اس طرح پوری انسانیت کو ایک ہی اصل کی طرف لوٹا دیا جائے: "يا أيها الناس إنا خلقنا كم من ذكر وأنثى وجعلناكم شعوبا و قبائل لتعارفوا" (حجرات: ١٣) (لوگو! ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا اور پھر تمہاری قومیں اور برادریاں بنادیں تا کہ تم ایک دوسرے کو پہچانو)۔ اسی طرح اس رسالت نے انسانوں

کے لئے ایک مشترک سماجی مشن کا تعین کیا:"**هو أنشاكم من الأرض واستعمركم فيها**" (ہود:۶۱) (وہی ہے جس نے تم کو زمین سے پیدا کیا ہے اور یہاں تم کو بسایا ہے)، "**وما خلقت الجن والإنس إلا ليعبدون**" (ذاریات:۵۶) (میں نے جن اور انسانوں کو اس کے سوا کسی کام کے لئے پیدا نہیں کیا ہے کہ وہ میری بندگی کریں)،اس نے انسانوں کے سامنے یہ واضح کیا کہ پوری زمین کسی اور پہلو سے قطع نظر صرف انسان کی انسانیت کو ملحوظ رکھتے ہوئے اس کے لئے ایک گھر ہے، نیز یہ کہ اس ہدایت اور رسالت کی روشنی میں جبر واستبداد، پروہتی، کسرویت اور قیصریت وغیرہ کے تمام عوامل ومحرکات کی نفی ہو جاتی ہے اور ان کی جگہ رحمت ورأفت سے پر ایسی نبوت لے لیتی ہے جو خلق خدا میں سے کسی کے لئے بھی تکلیف ومشقت کی روادار نہیں ہے بلکہ اس کی جدوجہد کا مقصد ہی یہ ہے کہ تمام انسانوں کو ان کی جکڑ بندیوں اور بیڑیوں سے آزاد کرایا جائے جن میں ان کو مقید کر دیا گیا ہے، اسی طرح گندی اور ناپاک چیزوں کو ان پر حرام قرار دیا جائے اور اس مشترک کلمہ کی بنیاد پر ان کی شیرازہ بندی کی جائے کہ وہ صرف اللہ وحدہ لاشریک کی عبادت کریں اور یہ کہ ان میں سے بعض اللہ کو چھوڑ کر بعض کو اپنا رب نہ بنائیں۔ کیونکہ رب بھی ایک ہی ہے، باپ بھی ایک ہی ہے اور زمین بھی ایک ہی ہے، تمام لوگ آدم کی اولاد ہیں اور آدمی کی تخلیق مٹی سے ہوئی تھی، اپنی آدمیت میں یہ اسی طرح برابر ہیں جس طرح کنگھی کے دندانے نیز یہ کہ ان کی مکمل اور ہمہ گیر کامیابی اسی میں ہے کہ وہ توحید کو اختیار کریں اور اپنے نفوس کا تزکیہ کریں تا کہ ان کی زندگی راہ راست پر آسکے اور وہ روئے زمین پر آبادکاری کا اپنا فریضہ انجام دے سکیں۔

## ختم نبوت:

اللہ عزوجل کی حکمت کا تقاضا ہوا کہ رسول اللہ ﷺ کی وفات اور آپ ﷺ کے اپنے رفیق اعلی سے جا ملنے کے بعد نبوت زمین سے اٹھالی جائے اور اس میں ہر قسم کی کجی سے

پاک اور محفوظ قرآن چھوڑ دیا جائے جو اپنی ہدایت اور حاکمیت کے ذریعہ انسانیت کی رہنمائی اور قیادت پر قادر رہے۔اس کتاب کے مطالعہ اور اس پر انسانی غور وخوض کے نتیجہ میں ''خلافت علی منہاج النبوۃ'' قائم کی جاسکتی ہے، یہ کتاب زندگی پر حکمرانی کرنے والی بلند اقدار اور ان سے اخذ کردہ اور مستفاد عمومی اقدار جیسے انصاف، آزادی، مساوات وغیرہ کی صورت میں عملاً موجود ہے۔

خلافت زمین کا دریافت کردہ ایک نیا تصور تھا، یہ اتھارٹی یا نگرانی کا کردار ادا کرنے والی وہ قیادت ہے جو کبھی کبھی حکومت کی صورت بھی اختیار کرلیتی ہے لیکن وہ اس کے منفی پہلوؤں، اس کے جبر واستعداد، اس کی پیچیدگیوں اور اس کے استکبار سے گریزاں ہوتی ہے۔اگر انسان کو اس کے حال پر چھوڑ دیا جائے تو وہ مشقتوں سے پر اس توازن تک رسائی حاصل کرسکتا ہے نہ اس کے نمونہ کی دریافت کرسکتا ہے، لیکن ''رأفت ورحمت پر مبنی نبوت'' نے انسانیت کے سامنے یہ نمونہ پیش کیا تاکہ وہ اسے استبدادی نظام یعنی انسان پر انسان کے جبر واستبداد کے بدل کے طور پر قبول کرسکے:''**وما أنت علیهم بجبار**''(ق:۴۵)(تمہارا کام ان سے جبراً بات منوانا نہیں ہے)،''**لست علیهم بمسیطر**''(غاشیہ:۲۲)(تم ان پر جبر کرنے والے نہیں ہو)۔اس سے جہاں ایک طرف استبدادی رجحان کا خاتمہ ہوتا ہے وہیں دوسری طرف انسانوں کے دیگر بندگان خدا کے مقابلہ میں اپنی خدائی کے تصور کی بھی نفی ہوتی ہے، لیکن قرآنی نصوص کے الٰہی اور منزل من اللہ ہونے کے باوجود ان کا سابقہ انسانوں سے پیش آتا ہے اور انسان ایک پیچیدہ ماحول اور مخلوط صورت حال میں رہنے والے لوگوں کا نام ہے، نص خواہ کتنی ہی بلند مرتبہ کیوں نہ ہو اور اس کا مضمون کتنا ہی عظیم کیوں نہ ہو جب انسانی صورت حال پر اس کا انطباق ہوگا تو اس میں دیگر مظاہر نیز فہم وتفسیر اور تاویل وتطبیق کے متنوع پہلو بھی شامل ہوں گے۔اس کی مثال چشمہ یا آسمان کے پانی کی سی ہے جس کا آغاز صاف وشفاف حالت میں ہوتا ہے اور اس کے

بعد کی دھاریں بھی اسی کی طرح صاف وشفاف ہوتی ہیں مگر یہی پانی جب زمین سے ملتا ہے اور اس پر اس کا بہاؤ شروع ہوتا ہے تو وہ اپنے ساتھ زمین کی مٹیاں، کیچڑ، کوڑا کرکٹ اور خش و خاشاک کو جس قدر اٹھا سکے اٹھاتا چلا جاتا ہے، اب اس کے بعد اس کی شکل ہی بدل جاتی ہے اور آپ کو اس کی ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ اسے صاف ستھرا اور آلودگی سے پاک کریں، یہی صورت حال وحی الٰہی اور اس کی آیات کے سلسلے میں انسانوں کے موقف نیز اس کے فہم کے ذرائع میں ان کے درمیان اختلاف رائے کی ہے۔

اگر انسانیت اللہ تعالی کی اس ہدایت کو قبول کر لیتی جو اس کے پاس اللہ کے برگزیدہ نبیوں کے واسطہ سے آئی تھی جس کا آغاز حضرت آدم علیہ السلام سے ہوا تھا اور جس کی درمیانی کڑی حضرت نوح وحضرت ابراہیم علیہما السلام تھے اور اس کی تکمیل محمد بن عبد اللہ ﷺ کے ذریعہ ہوئی پھر نبوت اور اس کے بعد کی خلافت علی منہاج النبوۃ اور اس کے نمونہ کو مضبوطی سے تھام لیتی تو توحید خالصتاً اللہ تعالی کے لئے ہوتی اور روئے زمین پر امن تعمیر اور تزکیہ کا دور دورہ ہوتا اور لوگوں پر آسمان سے رزق برستا اور زمین سے رزق ابلتا۔

لیکن انسانیت نے اس پیغام کو اس طرح قبول نہیں کیا جس طرح وہ نازل کیا گیا تھا اور نہ اس ہدایت اور اس نعمت سے پوری طرح وابستہ رہی جس سے اس کو نوازا گیا تھا۔اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ لوگ دوبارہ فرقوں میں بٹ گئے، ان میں مؤمن مسلم بھی ہوئے اور منکر ومغرور بھی: **"فمنهم ظالم لنفسه ومنهم مقتصد ومنهم سابق بالخيرات باذن الله"** (فاطر:۳۲) (اب کوئی تو ان میں سے اپنے نفس پر ظلم کرنے والا ہے، کوئی میانہ رو ہے اور کوئی اللہ کی توفیق سے نیکیوں میں سبقت کرنے والا ہے)۔یہاں انسانیت کے لئے کش مکش کا ایک نیا دور شروع ہوا، یہ دور اپنی ان بیشتر خصوصیات کی وجہ سے ممتاز تھا جن سے اب تک روئے زمین نا آشنا تھی۔چنانچہ پہلی مرتبہ انسانیت نے کچھ ایسے لوگوں کو دیکھا جو اس وقت تک جنگ سے گریز

کرتے تھے جب تک کہ کوئی ان سے آمادہ جنگ نہ ہو اور اگر ان کو جنگ کرنی بھی پڑتی تھی تو جنگ سے ان کا مقصد زمین میں سرکشی، فتنہ و فساد پھیلانا یا شخصی، قومی اور علاقائی اغراض کی تکمیل نہیں ہوتا تھا بلکہ ان کی جنگ اس لئے ہوتی تھی تا کہ انسان کی مرضی اور خواہش کو آزاد کرایا جائے، اس کی انسانیت اور اس کے شرف کا تحفظ کیا جائے اور اس کے انتخاب کے اس حق کی تائید کی جائے جو اللہ کی امانت کو قبول کرنے اور زمین میں خلافت کے مشن کی انجام دہی سے عبارت ہے۔ اس طرح لوگ دو کیمپوں میں تقسیم ہو گئے: ایک کیمپ کی کوشش یہ تھی کہ انسان کو انسان کے استبداد سے نجات دلائی جائے، انسانوں کو بندوں کی بندگی سے نکال کر صرف اور صرف اپنے رب کی بندگی کی طرف بلایا جائے، مذاہب کے ظلم و ستم سے چھٹکارا دلا کر اسلام کے عدل و انصاف کی طرف لایا جائے اور دنیا کی تنگی سے بچا کر دنیا اور آخرت کی وسعت سے ہم کنار کیا جائے۔ یہی لوگ درحقیقت اہل ایمان ہیں۔ دوسری طرف ایک منحرف اور گمراہ کیمپ تھا جو طواغیت اور سرکش حکمرانوں کی باتوں کا دفاع کرتا تھا جیسے: "وما علمت لكم من إله غيري" (قصص:۳۸) (میں تو اپنے سوا تمہارے کسی خدا کو نہیں جانتا)، "أنا ربكم الأعلى" (النازعات:۲۴) (میں تمہارا سب سے بڑا رب ہوں)۔ یہ اپنے اوصاف اور اندرونی درجہ بندیوں سے قطع نظر وہ لوگ تھے جو راہ راست سے منحرف ہو چکے تھے۔

## بعثت کے وقت روئے زمین کی صورت حال:

امام شافعی[1] (متوفی ۲۰۴ھ) فرماتے ہیں:

''جس وقت اللہ تعالی نے اپنے نبی اور رسول کو مبعوث فرمایا اس وقت لوگوں کے دو طبقات تھے:

پہلا طبقہ: ان اہل کتاب کا تھا جنہوں نے کتاب الٰہی کے احکام بدل ڈالے تھے، اللہ

---

۱- دیکھئے: امام شافعی کی ''الرسالہ'' قاہرہ، مکتبہ و مطبعہ مصطفی الحلبی، ۱۹۴۰ء، ص ۸-۱۴۔

کے ساتھ کفر کیا تھا اور اپنی زبان سے جھوٹ گھڑ کر اسے اس حق سے خلط ملط کر دیا تھا جو اللہ تعالی نے ان کی طرف نازل کیا تھا، چنانچہ اللہ تعالی نے اپنے نبی سے ان کے کفر کا حال بیان کرتے ہوئے فرمایا:"وان منهم لفريقا يلوون ألسنتهم بالكتاب لتحسبوه من الكتاب وما هو من الكتاب ويقولون هو من عند الله وما هو من عند الله ويقولون على الله الكذب وهم يعلمون" (آل عمران:۷۸)(ان میں کچھ لوگ ایسے ہیں جو کتاب پڑھتے ہوئے اس طرح زبان کا الٹ پھیر کرتے ہیں کہ تم سمجھو جو کچھ وہ پڑھ رہے ہیں وہ کتاب ہی کی عبارت ہے، حالانکہ وہ کتاب کی عبارت نہیں ہوتی۔ وہ کہتے ہیں کہ یہ جو کچھ ہم کہہ رہے ہیں یہ خدا کی طرف سے ہے حالانکہ وہ خدا کی طرف سے نہیں ہوتا۔ وہ جان بوجھ کر جھوٹ بات اللہ کی طرف منسوب کر دیتے ہیں)۔ ایک مقام پر اللہ تعالی نے فرمایا:"فويل للذين يكتبون الكتاب بأيديهم ثم يقولون هذا من عند الله ليشتروا به ثمنا قليلا فويل لهم مما كتبت أيديهم وويل لهم مما يكسبون" (بقرہ:۷۹)(پس ہلاکت اور تباہی ہے ان لوگوں کے لئے جو اپنے ہاتھوں سے شرع کا نوشتہ لکھتے ہیں پھر لوگوں سے کہتے ہیں کہ یہ اللہ کے پاس سے آیا ہوا ہے تا کہ اس کے معاوضے میں تھوڑا سا فائدہ حاصل کر لیں۔ ان کے ہاتھوں کا یہ لکھا بھی ان کے لئے تباہی کا سامان ہے اور ان کی یہ کمائی بھی ان کے لئے موجب ہلاکت)۔ ایک مقام پر ارشاد ہے:"وقالت اليهود عزير ابن الله وقالت النصارى المسيح ابن الله ذلك قولهم بأفواههم يضاهئون قول الذين كفروا من قبل قاتلهم الله أنى يؤفكون اتخذوا أحبارهم ورهبانهم أربابا من دون الله والمسيح ابن مريم وما امروا إلا ليعبدوا إلها واحدا لا إله إلا هو سبحانه عما يشركون" (توبہ:۳۰-۳۱)(اور یہود کہتے ہیں کہ عزیر خدا کے فرزند مجازی ہیں اور نصاری کہتے ہیں کہ مسیح خدا کے فرزند مجازی ہیں یہ ان کا قول ہے محض ان کے منہ سے (بک دینے کا) یہ بھی انہی لوگوں کی ایسی باتیں کرنے لگے جو ان

سے پہلے کافر ہو چکے ہیں اللہ انہیں ہلاک کرے یہ کدھر بہکے جا رہے ہیں انہوں نے اللہ کے ہوتے ہوئے اپنے علماء اور اپنے مشائخ کو (بھی) اپنا پروردگار بنا رکھا ہے اور مسیح ابن مریم کو (بھی) حالانکہ انہیں حکم صرف یہ دیا گیا تھا کہ ایک ہی معبود (برحق) کی عبادت کریں، کوئی معبود نہیں اس کے سوا، وہ اس سے پاک ہے جو یہ (اس کے ساتھ) شریک کرتے رہتے ہیں)۔

اسی طرح ایک اور مقام پر ارشاد ہے: **"ألم تر إلى الذين أوتوا نصيبا من الكتاب يؤمنون بالجبت والطاغوت ويقولون للذين كفروا هؤلاء أهدى من الذين آمنوا سبيلا أولئك الذين لعنهم الله ومن يلعن الله فلن تجد له نصيرا"** (نساء:۵۱-۵۲) (کیا تم نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جنہیں کتاب کے علم میں سے کچھ حصہ دیا گیا ہے اور ان کا حال یہ ہے کہ جبت اور طاغوت کو مانتے ہیں اور کافروں کے متعلق کہتے ہیں کہ ایمان لانے والوں سے تو یہی زیادہ صحیح راستے پر ہیں۔ ایسے ہی لوگ ہیں جن پر اللہ نے لعنت کی ہے اور جس پر اللہ لعنت کر دے پھر تم اس کا کوئی مددگار نہیں پاؤ گے)۔

دوسرا طبقہ: ان کفار کا تھا جنہوں نے اللہ تعالیٰ کے ساتھ کفر کرتے ہوئے ایسی بدعات ایجاد کی تھیں جن کی اللہ کی طرف سے کوئی سند نازل نہیں کی گئی تھی۔ ان لوگوں نے اپنے ہاتھوں سے اپنی پسند کے مطابق پتھروں اور لکڑیوں کے بت اور مجسمے بنا رکھے تھے اور ان کے نام بھی گھڑ رکھے تھے۔ یہ ان کو معبود کی حیثیت سے پکارتے اور ان کی پوجا کرتے تھے۔ اگر ان پرستش کردہ بتوں کے علاوہ دوسرے کچھ بت ان کو پسند آ جاتے تو وہ ان کو پھینک کر اپنے ہاتھوں سے دوسرے بت بنا لیتے اور ان کی پوجا شروع کر دیتے تھے، یہ عرب تھے۔ عجم میں سے بھی ایک گروہ نے اس سلسلہ میں ان کی نقش قدم کی پیروی کی اور ان ہی کی طرح مچھلی، جانور اور آگ وغیرہ جیسی اپنی دیگر پسندیدہ اشیاء کی پوجا کی۔ اس طبقہ کے جن لوگوں نے غیر اللہ کی بندگی کی ان میں سے بعض کے جواب کا ذکر اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی سے کیا ہے، چنانچہ اللہ رب العزت نے ان کا قول نقل

کرتے ہوئے فرمایا:"إنا وجدنا آباء نا علی أمة وإنا علی آثارهم مقتلون" (زخرف:۲۳) (ہم نے اپنے باپ دادا کو ایک طریقہ پر پایا ہے اور ہم ان ہی کے نقش قدم پر چل رہے ہیں)، "وقالوا لا تذرن آلهتكم ولا تذرن ودا ولا سواعا ولا يغوث ويعوق ونسرا وقد أضلوا كثيرا ولا تزد الظالمين إلا ضلالا" (نوح:۲۳-۲۴)(انہوں نے کہا: ہرگز نہ چھوڑو اپنے معبودوں کو اور نہ چھوڑو ود اور سواع کو اور نہ یغوث اور یعوق اور نسر کو۔ انہوں نے بہت لوگوں کو گمراہ کیا ہے اور تو بھی ان ظالموں کو گمراہی کے سوا کسی چیز میں ترقی نہ دے)، "واذكر في الكتاب إبراهيم إنه كان صديقا نبيا إذ قال لأبيه يا أبت لم تعبد ما لا يسمع ولا يبصر ولا يغني عنك شيئا" (مریم:۴۱-۴۲)(اس کتاب میں ابراہیم کا قصہ بیان کرو۔ بے شک وہ ایک راست باز انسان اور ایک نبی تھے۔ (انہیں ذرا اس موقع کی یاد دلاؤ) جب کہ اس نے اپنے باپ سے کہا کہ ابا جان آپ کیوں ان چیزوں کی عبادت کرتے ہیں جو نہ سنتی ہیں نہ دیکھتی ہیں اور نہ آپ کا کوئی کام بنا سکتی ہیں)، "واتل عليهم نبأ إبراهيم إذ قال لأبيه وقومه ما تعبدون قالوا نعبد أصناما فنظل لها عاكفين قال هل يسمعونكم إذ تدعون أو ينفعونكم أو يضرون" (شعراء۶۹-۷۳)(اور انہیں ابراہیم کا قصہ سناؤ جب کہ اس نے اپنے باپ اور اپنی قوم سے پوچھا تھا کہ یہ کیا چیزیں ہیں جن کو تم پوجتے ہو؟ انہوں نے جواب دیا: کچھ بت ہیں جن کی ہم پوجا کرتے ہیں اور ان ہی کی سیوا میں ہم لگے رہتے ہیں، اس نے پوچھا: کیا یہ تمہاری سنتے ہیں جب تم انہیں پکارتے ہو؟ یا یہ تمہیں کچھ نفع یا نقصان پہنچاتے ہیں؟)۔ اللہ تعالی نے ان کے اتحاد کو اپنی نعمت قرار دیتے ہوئے ان کی عمومی گمراہی نیز ان میں سے اہل ایمان پر اپنے احسان کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا:"واذكروا نعمة الله عليكم إذ كنتم أعداء فألف بين قلوبكم فأصبحتم بنعمته إخوانا وكنتم على شفا حفرة من النار فأنقذكم منها كذلك يبين الله لكم آياته لعلكم

تھتدون'' (آل عمران:۱۰۳)(اللہ کے اس احسان کو یاد رکھو جو اس نے تم پر کیا ہے۔تم ایک دوسرے کے دشمن تھے،اس نے تمہارے دل جوڑ دیئے اور اس کے فضل وکرم سے تم بھائی بھائی بن گئے،تم آگ سے بھرے ہوئے ایک گڑھے کے کنارے کھڑے تھے،اللہ نے تم کو بچالیا۔ اس طرح اللہ اپنی نشانیاں تمہارے سامنے روشن کرتا ہے شاید کہ ان علامتوں سے تمہیں اپنی فلاح کا سیدھا راستہ نظر آجائے)۔محمد ﷺ کے ذریعہ اللہ تعالی کی طرف سے بچائے جانے سے پہلے وہ اپنے اتحاد وافتراق میں کفر کے پیرو تھے،دو سب سے بڑی چیزیں تھیں جو ان کو متحد رکھتی تھیں:ایک اللہ کے ساتھ کفر۔دوسری ایسی چیزوں کی ایجاد جن کی اللہ تعالی نے کوئی سند نہیں اتاری تھی۔اللہ تعالی لوگوں کی افترا پردازیوں سے بالاتر ہے۔اس کے سوا کوئی معبود نہیں۔وہ پاک اور قابل تعریف ہے۔وہ ہر چیز کا رب اور اس کا خالق ہے۔ان میں جو لوگ زندہ تھے ان کی زندگی ان کے ذکر کردہ اوصاف کے مطابق قول وعمل میں اللہ کی نافرمانی اور اس کی معصیت میں ڈوبے ہونے کے سوا کچھ نہ تھی۔ان میں جو مر گئے وہ اپنے دفتر قول وعمل کے مطابق اللہ کے عذاب کے مستحق قرار پائے،پھر جب اللہ کی مقرر کردہ تقدیر اپنی حتمی مدت کو پہنچی تو اپنے پسندیدہ دین کے غلبہ سے متعلق اللہ تعالی کا فیصلہ ثابت ہو کر رہا۔چنانچہ اپنی وحی اور رسالت کے لئے اللہ تعالی نے اپنے برگزیدہ بندہ اور تمام مخلوقات میں افضل ہستی کا انتخاب کیا،اس پر اپنی رحمت کے دروازے کھول دیئے،اس کے ذریعہ نبوت کی تکمیل کی اور اس سے پہلے بھیجے گئے اپنے رسولوں کی تعلیمات کو اس کے ذریعہ درجہ کمال تک پہنچایا۔یہ شخصیت اپنی ذات کے اعتبار سے خلق خدا میں سب سے عالی مرتبت،دین و دنیا کے اخلاق فاضلہ کی سب سے زیادہ جامع اور انسانوں میں خاندان اور وطن کے لحاظ سے سب سے بہتر تھی یعنی اللہ کے بندہ اور اس کے رسول حضرت محمد ﷺ کی ذات بابرکت۔اللہ تعالی کا ارشاد ہے: **"لقد جاء کم رسول من أنفسکم عزیز علیه ما عنتم حریص علیکم بالمؤمنین رووف رحیم"** (توبہ۱۲۸)(تم لوگوں

کے پاس ایک رسول آیا ہے جو خود تم ہی میں سے ہے۔تمہارا نقصان میں پڑنا اس پر شاق ہے۔ تمہاری فلاح کا وہ حریص ہے۔ایمان لانے والوں کے لئے وہ شفیق اور رحیم ہے)، "**وانه لذکر لک ولقومک وسوف تسئلون**"(زخرف:۴۴)(اور بے شک یہ (کتاب) تمہارے لئے اور تمہاری قوم کے لئے نصیحت ہے۔عنقریب تم سے باز پرس ہوگی)،"**ولتنذر أم القری ومن حولها**"(انعام:۹۲)(یہ کتاب اس لئے نازل کی گئی ہے) کہ تم اس کے ذریعہ بستیوں کے مرکز (یعنی مکہ) اور اس کے اطراف میں رہنے والوں کو متنبہ کرو)،"**وانذر عشیرتک الأقربین**"(شعراء:۲۱۴)(اپنے قریب ترین رشتہ داروں کو ڈراؤ)۔اللہ تعالی نے اس انداز میں آپ ﷺ کی قوم اور آپ ﷺ سے قریب تر رشتہ داروں کا بطور خاص ذکر فرمایا اور ان کے بعد دوسرے لوگوں کا تذکرہ عمومی انداز میں فرمایا۔

اللہ تعالی نے قرآن کریم کے ذریعہ اپنے رسول کا آوازہ بلند کیا، پھر انذار میں آپ کے قبیلہ کا بطور خاص ذکر کرتے ہوئے فرمایا:"**وانذر عشیرتک الأقربین**"(شعراء:۲۱۴) (اپنے قریب ترین رشتہ داروں کو ڈراؤ)۔

مشہور حنفی فقیہ امام سرخسیؒ (متوفی:۴۹۰ھ) چوتھی صدی ہجری کے فقہی تصور کے ذیل میں مسلم اور غیر مسلم تعلقات میں ہونے والی تدریجی پیش رفت کی تصویر کشی کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"خلاصہ کلام یہ کہ جہاد اور قتال کا حکم ترتیب وار نازل ہوا ہے، چنانچہ ابتداء میں نبی کریم ﷺ کو اپنا پیغام پہنچانے اور مشرکین سے اعراض کا حکم دیا گیا تھا۔ارشاد باری ہے: "**فاصدع بما تؤمر وا غرض عن المشرکین**"(حجر:۹۴)(پس اے نبی! جس چیز کا تمہیں حکم دیا جارہا ہے اسے ہانکے پکارے کہہ دو اور شرک کرنے والوں کی ذرا پروانہ کرو)،"**فاصفح الصفح الجمیل**"(حجر:۸۵)(تم شریفانہ درگذر سے کام لو)، پھر اللہ تعالی نے احسن اسلوب اور انداز میں بحث ومباحثہ کا حکم دیتے ہوئے فرمایا:"**ادع إلی سبیل**

ربک بالحکمة والموعظة الحسنة وجادلهم بالتي هي أحسن" (نحل:۱۲۵)(اے نبی ﷺ! اپنے رب کے راستہ کی طرف دعوت دو حکمت اور عمدہ نصیحت کے ساتھ اور لوگوں سے مباحثہ کرو ایسے طریقہ پر جو بہترین ہو)،"ولا تجادلوا أهل الكتاب إلا بالتي هي أحسن"(عنکبوت:۴۶)(اور اہل کتاب سے بحث نہ کرو مگر عمدہ طریقہ سے)۔اس کے بعد مسلمانوں کو ان الفاظ میں جنگ کی اجازت دی گئی:"أذن للذين يقاتلون بأنهم ظلموا" (حج:۳۹)(اجازت دے دی گئی ان لوگوں کو جن کے خلاف جنگ کی جارہی ہے، کیونکہ وہ مظلوم ہیں)، پھر قرآنی آیات ہی کے ذریعہ مسلمانوں کو غیر مسلموں سے اس شرط کے ساتھ جنگ کا حکم دیا گیا کہ اگر پہل غیر مسلموں کی طرف سے ہو تو وہ ان سے جنگ کریں، پھر محترم مہینوں کے گذر جانے کی شرط کے ساتھ انہیں قتال کا حکم دیا گیا جیسا کہ ارشاد باری ہے:"فإذا انسلخ الأشهر الحرم فاقتلوا المشركين حيث وجدتموهم وخذوهم واحصروهم واقعدوا لهم كل مرصد" (توبہ:۵)(پس جب حرام مہینے گذر جائیں تو مشرکین کو قتل کرو جہاں پاؤ اور انہیں پکڑو اور گھیرو اور ہر گھاٹ میں ان کی خبر لینے کے لئے بیٹھو)۔ یہی مرحلہ آخری اور فائنل قرار پایا اور امر مطلق لزوم کا متقاضی ہوتا ہے، البتہ قتال کی فرضیت سے مقصود دین کو غالب کرنا اور اہل شرک کو زیر کرنا ہے"(۱)۔

اس سے قطع نظر کہ امام شافعی (۲) اور امام سرخسی کی پیش کردہ اس تصویر پر عصر حاضر میں

---

۱- دیکھئے: سرخسی کی "السیر الکبیر" (۱۸۸/۱)۔اس عبارت سے امام سرخسی کا مقصد یہ واضح کرنا ہے کہ جب وہ پر امن ذرائع جن کے اختیار کرنے کا رسول اللہ ﷺ کو حکم دیا گیا تھا، انسان کے اپنے دین کے انتخاب سے متعلق ارادہ کو آزاد کرانے اور اس ارادہ پر سے ظالموں اور سرکشوں کے تسلط کو ختم کرنے میں ناکام ثابت ہوئے تو جنگ کی اجازت دی گئی پھر اسی آزادی کے حصول اور اس کی بقا کی ضمانت کے لئے جنگ کا حکم دیا گیا تا کہ مشرکین کو اہل ایمان پر ظلم کرنے اور ان کو اپنے مذہب کے انتخاب سے متعلق حاصل اس آزادی کو چھیننے سے باز رکھا جائے جو شرعی احکام کی پابندی کا دارومدار قرار دی گئی ہے۔

۲- دیکھئے: امام شافعی کی "الرسالہ" قاہرہ، مکتبہ ومطبعہ مصطفیٰ الحلبی، ۱۹۴۰ء ص ۸-۱۴۔

علمی نقد و مباحثہ کی گنجائش ہے، اہم بات یہ ہے کہ ان دونوں بزرگوں نے اس دور کی صورت حال بیان کی ہے جس سے آخری نبوت اور اس نبوت پر مبنی خلافت کو سابقہ پیش آیا تھا۔ آخری نبوت کے طرز پر تشکیل شدہ خلافت نے نبوت ہی کا طریقہ کار اختیار کرتے ہوئے لوگوں کے سامنے ان کے رب کی آیات کی تلاوت کی، انہیں کتاب وحکمت کی تعلیم دی، ان کا تزکیہ کیا، جو لوگ سننا نہیں چاہتے تھے اور کتاب وحکمت کی تعلیم وتزکیہ سے فائدہ نہیں اٹھانا چاہتے تھے ان کے ساتھ اعراض بلکہ بہتر عفو و درگذر کی پالیسی اپنائی، نیز ان کی انسانیت اور ان کے انسانی شرف و مقام کو ہمیشہ تسلیم کیا، اس امید کے ساتھ ان کو دعوت دی نیز حکیمانہ اسلوب اور بہتر نصیحت کے ذریعہ ان سے مباحثہ کیا کہ ان کے اندر اپنی شخصیت کا شعور جاگے گا، وہ اپنی انسانیت کا ادراک کریں گے اور اپنے مشن کے لئے بیدار ہو جائیں گے، لیکن بیشتر قومیں لغویت اور جھوٹی عظمتوں کا شکار ہو کر سرکشی میں مبتلا رہیں، دنیا کے سرکش اور جابر حکمراں انہیں جادہ حق سے ہٹاتے اور راہ راست سے بھٹکاتے رہے، ہمیشہ ان کی یہ کوشش رہی کہ حق کو نیست و نابود کر دیں تا کہ باطل اپنی خرمستیوں، اپنے غرور، اپنی لغویت اور بے حیائی کے ساتھ قائم و دائم رہے حالانکہ اللہ تعالی نے کائنات کی تخلیق اس مقصد کے لئے نہیں فرمائی تھی: "**وما خلقنا السموات والأرض وما بينهما لاعبين**" (دخان:۳۸) (یہ آسمان و زمین اور ان کے درمیان کی چیزیں ہم نے کچھ کھیل کے طور پر نہیں بنادی ہیں)۔

اسی طرح اللہ تعالی نے انسانوں کو بے مقصد نہیں پیدا کیا: "**أفحسبتم أنما خلقناكم عبثا وأنكم إلينا لا ترجعون**" (مؤمنون:۱۱۵) (کیا تم نے یہ نہیں سمجھ رکھا تھا کہ ہم نے تمہیں فضول پیدا کیا ہے اور تمہیں ہماری طرف کبھی پلٹنا ہی نہیں ہے)، "**أيحسب الإنسان أن يترك سدى**" (قیامہ:۳۶) (کیا انسان یہ سمجھتا ہے کہ اسے یوں ہی چھوڑ دیا جائے گا)، لہذا لغویات، باطل اور لہو ولعب پر آمادہ کرنے والی، نیز بندوں کو ان کا غلام بنانے والی، انہیں ذات

واحد کی بندگی سے روکنے والی اور ان کو مقصد تخلیق سے دور کرنے والی رکاوٹوں کا خاتمہ ضروری تھا۔یہ ناگزیر تھا کہ اس صورت حال کی بنیاد پر وقتی طور پر ہی سہی لوگوں کے درمیان امتیاز کیا جائے تا کہ وہ رکاوٹیں دور ہو جائیں جو عہد گذشتہ میں مستحکم اور راسخ ہو چکی تھیں اور باوجود انبیاء سابقین کی بیشتر اور متنوع کوششوں کے دور نہیں ہوئی تھیں۔اگر یہ امتیاز نہ برتا جاتا تو مسلمان اور مجرم اور توحید پرست اہل ایمان اور اہل شرک ایک جیسے قرار پاتے حالانکہ وہ دونوں برابر نہیں ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم نے اس بات کا اہتمام کیا کہ ان غیر معمولی صورت حالات کے تعلق سے جن میں لوگوں نے انبیاء سابقین کی پیش کردہ ہدایات کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا، مسلمانوں کے شعور کو بیدار کیا جائے اور ان کی ذہن سازی کی جائے تا کہ ایک عرصہ کے بعد ہی سہی نظام درست ہو جائے۔اور انسانیت اپنے اصل مقصد کی طرف لوٹ آئے جس کی خاطر ہی اس کی تخلیق و پرورش ہوئی ہے یعنی حق اور حقیقت کی وحدت کے ساتھ ساتھ رب کی وحدانیت، باپ کی وحدت، بنیاد کی وحدت اور گھر یعنی "کائنات" کی وحدت۔اس ذہن سازی کا مقصود یہ تھا کہ ایک ایسی نفسیاتی اور ذہنی تقسیم پیدا کی جائے جس کے ذریعہ ایمان لانے والوں اور ہدایت کو قبول کرنے والوں کو ان لوگوں سے ممتاز کیا جا سکے جو حق کا چراغ گل کرنا چاہتے تھے۔

قرآن کریم ایسے بہت سے مامورات اور منہیات اور ایسی بیشتر ہدایت سے پر ہے جو اہل ایمان کے اندر ان کی انسانیت، ان کے عظیم الشان خالق سے ان کی نسبت و تعلق اور انبیائی امت کے کارواں میں ان کی شمولیت کا شعور بیدار کر کے اور ان کو ان کے فرائض کا احساس دلا کر ان مقاصد کی تکمیل کرتی ہیں۔اہل ایمان ان لوگوں کو دعوت دینے میں کامیاب ہوئے جنہیں ہدایت نہیں ملی تھی اور دعوت نہیں پہنچی تھی یا پہنچ تو گئی تھی مگر وقت کے طاغوتوں نے انہیں کفر اختیار کرنے پر مجبور کر رکھا تھا اور دین پسندی اور مذہب کے انتخاب کے سلسلے میں ان کی آزادی سلب کر رکھی تھی۔

اس چیز نے اہل ایمان کے اندر انسانی شرف اور ایمانی تفوق کا احساس پیدا کیا اور انہیں لشکر شیاطین کے اٹھائے ہوئے طوفانوں کے مقابلہ میں ڈٹ جانے کا حوصلہ عطا کیا۔ مندرجہ ذیل آیات کا سیاق یہی ہے:

"ولله العزة ولرسوله وللمؤمنين ولكن المنافقين لا يعلمون" (منافقون:۸)(عزت تو اللہ اور اس کے رسول اور مومنین کے لئے ہے، مگر یہ منافق جانتے نہیں ہیں)، "ولا تهنوا ولا تحزنوا وأنتم الأعلون إن كنتم مؤمنين" (آل عمران:۱۳۹)(دل شکستہ نہ ہو، غم نہ کرو، تم ہی غالب رہو گے اگر تم مومن ہو)، اسی طرح ان آیات کا سیاق بھی یہی ہے جو کفر سے بیزاری کی دعوت دیتی ہیں اور اسے انسان کی اپنی انسانیت سے دست بردار ہونے کے مترادف قرار دیتی ہیں جیسے: "إن شر الدواب عند الله الصم البكم الذين لا يعقلون" (انفال:۲۲)(یقیناً خدا کے نزدیک بدترین قسم کے جانور وہ بہرے گونگے لوگ ہیں جو عقل سے کام نہیں لیتے)، "ولقد ذرأنا لجهنم كثيرا من الجن والإنس لهم قلوب لا يفقهون بها ولهم أعين لا يبصرون بها ولهم آذان لا يسمعون بها أولئك كالأنعام بل هم أضل أولئك هم الغافلون" (اعراف:۱۷۹)(اور یہ حقیقت ہے کہ بہت سے جن اور انسان ایسے ہیں جن کو ہم نے جہنم ہی کے لئے پیدا کیا ہے۔ ان کے پاس دل ہیں مگر وہ ان سے سوچتے نہیں، ان کے پاس آنکھیں ہیں مگر وہ ان سے دیکھتے نہیں، ان کے پاس کان ہیں مگر وہ ان سے سنتے نہیں، وہ جانوروں کی طرح ہیں بلکہ ان سے بھی زیادہ گئے گذرے، یہ وہ لوگ ہیں جو غفلت میں کھو گئے ہیں)۔

پھر خود فریبی میں مبتلا ان متکبرین کی محبت سے روکا گیا جنہوں نے کفر کو ایمان پر ترجیح دی تھی، اس امید میں کہ اگر ان کے اندر یہ احساس پیدا ہو گیا کہ اب وہ محبت، احترام اور اکرام کے مستحق نہیں رہے تو وہ اپنے موقف پر نظر ثانی کرنے پر مجبور ہوں گے، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے

فرمایا:"لا تجد قوما یؤمنین باللہ والیوم الآخر یوادون من حاد اللہ ورسولہ" (مجادلہ:۲۲)(تم کبھی نہ پاؤ گے کہ جولوگ اللہ اور آخرت پر ایمان رکھنے والے ہیں وہ ان لوگوں سے محبت کرتے ہوں جنھوں نے اللہ اور اس کے رسول کی مخالفت کی ہے)، ان کی ولایت (دوستی) سے منع کیا گیا، کیونکہ وہ اپنی خودفریبی اور نخوت پر قائم رہتے ہوئے نیز اللہ اور اس کے رسول اور اہل ایمان سے دشمنی کے درپے ہوتے ہوئے اس کے مستحق نہیں رہ جاتے، اللہ تعالی کا ارشاد ہے:"یا أیھا الذین آمنوا لا تتخذوا عدوي وعدوکم أولیاء" (ممتحنہ:۱)(اے لوگو جو ایمان لائے ہو! میرے اور اپنے دشمنوں کو دوست نہ بناؤ)۔

جب یہ اندیشہ پیدا ہوا کہ محدود اور ناقص درجہ کی ولایتیں ان تعلیمات پر عمل کرنے میں حارج ہوں گی تو قرآن کریم نے اس طرف خصوصی توجہ دلائی:"لن تنفعکم أرحامکم ولا أولادکم یوم القیامۃ یفصل بینکم واللہ بما تعملون بصیر" (ممتحنہ:۳)(قیامت کے دن نہ تمہاری رشتہ داریاں کسی کام آئیں گی نہ تمہاری اولاد، اس روز اللہ تمہارے درمیان جدائی ڈال دے گا اور وہی تمہارے اعمال کا دیکھنے والا ہے)۔

اس ہدایت کو عملی جامہ پہنانے سے متعلق لوگوں کے دلوں میں پیدا ہونے والے تردد کا ازالہ کرتے ہوئے اللہ تبارک وتعالی نے اس پہلو کی طرف توجہ دلائی کہ انہیں کسی نئے حکم کا مکلف نہیں بنایا جارہا ہے بلکہ انہیں ایک ایسے مشن کا مکلف بنایا جارہا ہے جس کے حامل زمانہ ماضی میں ان کے علاوہ دوسرے لوگ اور خود ان کے جد امجد اور اسوہ حضرت ابراہیم علیہ السلام رہ چکے ہیں، کیونکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے عہد کا منظر نامہ پوری طرح لوٹ آیا ہے:"قد کانت لکم أسوۃ حسنۃ في إبراھیم والذین معہ" (ممتحنہ:۴)(تم لوگوں کے لئے ابراہیمؑ اور اس کے ساتھیوں میں ایک اچھا نمونہ ہے)۔

جب یہ تربیت پایہ تکمیل کو پہنچے گی تو انسانی رویوں اور انسان کے متنوع تعلقات پر اس

کے اثرات مرتب ہوں گے۔ان ہی میں سے ایک اس جگہ سے اس کا تعلق ہے جہاں وہ دوسروں کے ساتھ مل کر رہا ہو۔اسی ضرورت کے پیش نظر فقہاء نے زمین کی دو قسمیں کیں:

## دارالاسلام اور دارالحرب:

عرب ان امتوں میں سے ایک امت تھے جن کے پاس محمد ﷺ سے پہلے نہ کوئی نبی آیا اور نہ آپ کی رسالت سے پہلے انہوں نے کوئی رسالت پائی۔اس مفہوم میں یہ ایک امی (۱) قوم تھی، کسی فلسفہ نے ان کے اندر پیچیدگی پیدا نہیں کی تھی نہ ان کی عقلوں میں تعریف، تاویل اور تفسیر کی گتھیوں کی آمیزش ہوئی تھی، عہد رسالت اور اس سے قریب کی دہائیوں میں ان کی ثقافت ایک زبانی ثقافت تھی۔ان کے پاس قرآن اور تھوڑے بہت سنن و احکام کے سوا آج کی طرح کوئی مدون اور مرتب نص نہیں تھی (۲)، ان کے علوم و آداب، تواریخ اور تہذیب زبانی منتقل ہوتے تھے۔ان کا یہی طریقہ کار نص قرآنی سے متعلق تشکیل پانے والے مختلف فہم کے سلسلے میں بھی رہا، یہاں تک کہ قدرے بعد کے دور میں سست رفتاری سے اس ثقافت کی تدوین کا عہد شروع ہوا جب علماء اور بطور خاص فقہاء نے ۸۳ھ میں سنن کی تدوین کا آغاز کیا، اس کے بعد انہوں نے ۱۴۳ھ میں ان تمام علوم کی تدوین کا کام انجام دیا جو امت کی ثقافت کے نام سے

---

۱- امی کا پہلا مفہوم جس کی طرف ذہن جلدی سے منتقل ہوتا ہے، یہ ہے کہ اس سے مراد وہ شخص ہے جو نہ پڑھتا ہو نہ لکھتا ہو۔اس کا دوسرا مفہوم جس کی طرف ذہن تیزی سے نہیں جاتا اور غور و فکر کا متقاضی ہوتا ہے، یہ ہے کہ امی وہ شخص ہے جس کا تعلق کسی ایسی قوم سے ہو جس کے پاس کوئی کتاب نہ ہو جیسے مشرکین عرب وغیرہ۔ دیکھئے: حضرت ابن عباسؓ کا وہ قول جسے ابن جریر طبری نے اپنی تفسیر جامع البیان (۳/ ۱۴۳) میں نقل کیا ہے۔اسی طرح ملاحظہ ہو: ہمارے زیر طبع مقالہ میں تحریر کردہ تفصیلات جس کا عنوان ہے: "**عربية القرآن و مستقبل الأمة القطب حول الأمي والأميين والمراد بهما**"۔

۲- دیکھئے: ابن خلدون کا مقدمہ جس کو انہوں نے علوم اسلامیہ اور ان کے آغاز کی تاریخ کے مقدمہ کے طور پر تحریر کیا ہے۔

معروف ہے(۱)۔

تدوین کا یہ عمل تسلسل کے ساتھ جاری رہا یہاں تک کہ پایہ تکمیل کو پہنچ گیا اور مختلف علوم اور متنوع فنون پر مجموعے مرتب کیے گئے، ان تمام مجموعوں کا محور نص قرآنی اور رسول اللہ ﷺ کی سنتیں تھیں، پھر فقہ، اصول فقہ اور دیگر موضوعات پر مجموعے مرتب ہونا شروع ہوئے، یہ وہ وقت تھا جب خلافت پر مبنی اور اس کی وارث حکومت کش مکش اور جہاد کی ان کارروائیوں سے گزر رہی تھی جن کے نتیجہ میں وہ دنیا کی بیشتر اقوام سے علاحدہ رہنے اور فاصلہ بڑھانے کی صورت حال سے دوچار ہوئی۔ اسی ضرورت کے پیش نظر اس دور کے مسلمان فقہاء اور مفکرین نے اس پیش آمدہ صورت حال کو قانونی شکل عطا کی اور اسے اس کے فقہی دائرہ میں رکھتے ہوئے اور زمین اور اہل زمین سے متعلق اسلام اور مسلمانوں کے موقف کی وضاحت کرتے ہوئے زمین کو دو حصوں میں تقسیم کیا: ایک حصہ کا نام ''دارالاسلام'' تھا جس میں لوگ اسلام کے عطا کردہ امن سے مستفید ہوتے تھے اور ان کے درمیان اسلامی احکام کا نفاذ ہوتا تھا اور دوسرے حصے کا نام ''دارالحرب'' تھا جس میں لوگوں کو نہ اسلام کی طرف سے کوئی تحفظ حاصل تھا اور نہ ان پر اسلام کے احکام نافذ ہوتے تھے۔ بعض فقہاء نے ایک تیسری قسم ''دارالعہد'' کا اضافہ کیا۔ اس قسم کی بنیاد دراصل ایک واقعی صورت حال کی فقہی ضابطہ بندی پر تھی۔ یہ نظریہ سازی کے بنیادی ماخذ سے مستفاد کوئی نظریاتی قانون سازی نہیں تھی، کیونکہ صرف قرآن ہی وہ اساس ہے جس پر اسلامی تصور مبنی ہوتا ہے اور احکام صادر کرنے کا مصدر صرف اور صرف یہی ہے جس کی وضاحت اس توضیحی ماخذ میں کردی گئی ہے جو واجب العمل ہے یعنی سنت، اسی طرح اسلامی تصور کی تمام اساسیات اور اس کے تمام مبادی بھی صرف اور صرف قرآن پر مبنی ہیں۔

---

۱- دیکھئے: سیوطی کی ''تاریخ الخلفاء'' میں ذکر کردہ تفصیل جو انہوں نے امام ذہبی کی ''تاریخ الاسلام'' سے نقل کی ہے، تحقیق محمد ابو الفضل ابراہیم، قاہرہ: دارالنہضہ، ۱۹۷۶ء، نیز محمد عابد الجابری کی کتاب ''تکوین العقل العربی'' کا مقدمہ بیروت: المرکز الثقافی العربی ۱۹۹۱ء۔

## اسلام کی عالم گیریت:

اسلامی تصور اپنے ابتدائی ایام ہی سے ایک عالمگیر تصور ہے۔عالم گیریت کا تصور اس کے تمام پہلوؤں میں رچا بسا ہوا ہے،خواہ وہ اعتقادی ہوں یا شرعی۔اسی طرح کائنات،انسان اور زندگی سے متعلق اسلام کے کل نظریہ میں اس کی روح کارفرما ہے۔عربوں کی زبان میں خود ان ہی میں سے ایک رسول پر جوان کے مقدس شہر ام القری (مکہ) میں رہ رہا تھا قرآن مجید کا نزول ایک عرب شخص کے لئے اس پیغام کی عالمگیریت،اس کے عموم اور اس کی ہمہ گیری کے سمجھنے میں رکاوٹ نہیں بنا۔وہ اس مشن کے ادراک سے قاصر نہیں رہا کہ اسے اس پیغام کا حامل بن کر اس کو روئے زمین کے چپے چپے تک پہنچانا ہے۔وہ اس حقیقت کے سمجھنے سے بھی غافل نہیں رہا کہ یہ ذمہ داری رسول اللہ ﷺ کی وفات کے بعد ان کی اس امت کی طرف منتقل ہوجائے گی جسے لوگوں کی بھلائی کے لئے برپا کی گئی ایک ''امت قطب(۱)'' (محوری امت) ہونا چاہئے۔کیونکہ یہی امت تمام لوگوں کو ہدایت،حق اور ان تمام اقدار کے گرد جمع کرے گی جو اس پیغام میں مضمر ہیں۔

## اسلام سے پہلے بین الاقوامی تعلقات:

اسلام میں عالمگیریت کے اصول نیز مسلمانوں کی نظر میں بین الاقوامی تعلقات کی تنظیم میں مؤثر دیگر بنیادی اصولوں کی تفصیل میں جانے سے پہلے ہم مختصراً اس پہلو کی طرف اشارہ کرنا چاہیں گے کہ اسلام سے قبل ان تعلقات کی نوعیت کیا تھی؟

---

۱- میرے علم کی حد تک ڈاکٹر منی ابوالفضل پہلی وہ مصنفہ ہیں جنہوں نے عرب حلقوں میں ''امت قطب'' کے تصور کی بنیاد تلاش کی ہے اور اس کا استعمال کیا ہے،اس نام سے ان کی ایک کتاب بھی ہے جو قاہرہ میں طبع ہوئی ہے۔پہلا ایڈیشن دار الطوبجی کا ہے جو ۱۹۸۳ء میں چھپا۔اس کا دوسرا ایڈیشن قاہرہ میں المعہد العالمی للفکر الاسلامی کی طرف سے ۱۹۹۸ء میں چھپا۔ڈاکٹر موصوفہ اسے مطلق استعمال کرتی ہیں اور اس سے ان کی مراد عرب امت اور اس کا اسلامی تناظر ہے۔

حیثیین (۱)(Hittites) کی دستاویزات میں ایک اصول ہے جو ہمارے خیال میں نزول قرآن کے وقت دنیا کے مسلمہ اصولوں میں سے ایک تھا، وہ یہ ہے کہ حیثیین اور دیگر اقوام کے درمیان یا تو تحفظ کا تعلق ہے یا اتحاد کا، تعلقات کی ان دو شکلوں کے علاوہ بقیہ ساری دنیا ان کی دشمن ہے اور ان کے ممالک جنگ کے مقامات ہیں۔ طاقتور کو یہ حق حاصل ہے کہ ان کی وہ تمام چیزیں ہتھیا لے جن پر اس کی افواج قابض ہونے کی قدرت رکھتی ہوں۔ پروفیسر کارڈاشا کہتے ہیں: حیثیین کا بادشاہ اپنے خارجہ تعلقات میں یا تو حفاظت یافتہ لوگوں سے آشنا تھا یا ان معاہدین سے جن سے وہ دوطرفہ شرائط کے ذریعہ مربوط تھا، یا دشمنوں سے، یہ تیسری قسم ان لوگوں کی تھی جن سے جنگ کرنا اس کا مشن تھا، رمسیس دوم (Ramses II) ان کے ساتھ کئے گئے اپنے معاہدہ میں یہ دعوی کرتا ہے کہ اسے روئے زمین پر جہاں تک وہ چاہے اپنے ملک کی سرحدیں پھیلانے کا حق حاصل ہے (۲)۔

جاک بیرن کہتا ہے کہ رمسیس دوم نے یہ اعلان کر دیا تھا کہ "رع" (۳) نے اسے تمام ممالک عطا کر دئے ہیں اور دنیا کے تمام ممالک ہمیشہ ہمیش اس کے جوتوں تلے سجدہ ریز ہوتے رہیں گے یہاں تک کہ وہ تمام ملکوں میں جہاں تک چاہے اپنے ملک کی سرحدیں قائم کر لے گا (۴)۔

---

۱- حیثیین (Hittites) ایک قوم ہے جس کی حکومت ایشیائے کوچک (Asia Minor) پر تھی، ان کا زریں دور بارہویں صدی سے اٹھارہویں صدی قبل مسیح تک رہا ہے۔

۲- ملاحظہ ہو: "تاریخ العظم" ص ۴۹، تیرہواں ایڈیشن پیرس، ۱۹۵۴ء۔

۳- یہ مصری تہذیب کی تاریخ میں ایک نگراں دیوتا (Guardian Deity) کا نام ہے، ان کا خیال تھا کہ تمام نگراں دیوتا سورج کے اس عظیم دیوتا (Re) میں ضم ہو گئے ہیں، نیز یہ کہ وہ نیکی، انصاف اور سچائی کا خدا ہونے کے ساتھ ساتھ پوری کائنات کے اخلاقی نظام کو قائم رکھنے والا بھی ہے، دیکھئے: The University History of the World. By William MC Gill (مترجم)۔

۴- ملاحظہ ہو: تاریخ حضارۃ مصر الفرعونیہ ۲/ ۳۶۲۔

عبرانیوں (Hebrews) کی عبارتیں بھی اس طرح کی ہیں، چنانچہ کتاب ''استثناء'' میں ہے:

''جب تم جنگ کی غرض سے نکل کر کسی شہر کے قریب پہنچو تو اسے خود سپردگی کی دعوت دو، اگر وہ اسے تسلیم کر لے اور تمہارے لئے اپنے دروازے کھول دے تو اس میں موجود پوری قوم تمہاری تابع اور غلام ہوگی اور اگر وہ تمہارے آگے سپردگی سے انکار کر دے اور جنگ کرنا چاہتا ہو تو اس کی گھیرا بندی کرو اور جب تمہارا قائم رہنے والا خدا بادشاہ وہ شہر تمہارے حوالہ کر دے تو تم تلوار سے اس کے تمام باشندوں کو چور چور کر ڈالو، جہاں تک عورتوں، بچوں اور چوپایوں کا تعلق ہے تو وہ مال غنیمت ہیں'' (۱)۔

اسی طرح کتاب ''استثناء'' ہی میں مذکور ہے:

''جہاں تک ان قوموں کا تعلق ہے جو تمہیں تمہارے قائم خدا کی طرف سے میراث کے طور پر عطا کی جائیں تو تم ان میں سے کسی متنفس کو زندہ نہ چھوڑو'' (۲)۔

اہل روم کا موقف بھی اس سے مختلف نہیں تھا۔ امبلیو بٹی کہتا ہے:

''قدیم معاشرہ میں ایک حکومت کی صورت میں کسی منظم معاشرہ کا قانونی نظام اپنی سرگرمیوں کے اعتبار سے اپنے ہی ممبروں تک محدود ہوتا تھا، اس میں غیر ملکیوں کا کوئی حصہ نہیں ہوتا تھا''۔

اپنی اساس کے لحاظ سے قدیم ترین رومن لا کی صورت حال یہی تھی:

''طبقہ اشرافیہ کا شہری اور قومی قانون صرف شہروں پر نافذ ہوگا، قرطاج (Carthage) کا شہری اور قومی قانون صرف قرطاجیوں (Carthaginians) تک محدود ہوگا۔ عام طور پر ہر قدیم قانون نفاذ کے اعتبار سے یا تو شخصی ہوتا تھا یا قومی۔ ان قوانین کا اختتام

۱- دیکھئے: کتاب ''استثناء'' ۱۰/۱۰-۱۵۔

۲- حوالہ سابق ۱۰/۱۰-۱۵۔

اس ضابطہ پر ہوتا تھا کہ قابل مداخلت قانونی اسباب پر مبنی منظم اصولوں کے مطابق ایک غیر ملکی شخص غیر ملک میں تمام حقیقی اور ثانوی حقوق سے محروم ہوگا۔لہذا اپنے وطن سے باہر کسی انسان کی کوئی قانونی حیثیت نہیں ہوتی تھی" (۱)۔ سچی بات یہ ہے کہ غیر ملکی بنیادی طور پر ان تمام نظاموں میں دشمن مانا جاتا تھا، چنانچہ لاطینی زبان میں لفظ "Italics" یعنی "غیر ملکی" کو دشمن قرار دیا جاتا رہا اور اس کے دوہرے معانی مراد لئے جاتے رہے، کیونکہ جو شخص غیر ملکی ہوتا تھا وہ اسی وقت ان کی نظر میں دشمن بھی ہوتا تھا۔

قانونی نظاموں کے شارحین کا اس میں اختلاف ہے کہ غیر شہری یا غیر معاہد کو جنگ جو دشمن قرار دینے اور اس پر بلا جواز بھی ظلم و جارحیت میں پہل کرنے کے تصور کی بنیاد کیا ہے؟ بعض کے نزدیک اس کا ماخذ وہ مذہبی اساس ہے جس کی رو سے بادشاہ کو آسمان سے یا اس کے معبودوں کی طرف سے پوری روئے زمین پر بلا شرکت غیرے حکمرانی کا اختیار دیا گیا ہے، لہذا اسے اپنے زیر اقتدار ملک کی سرحدوں سے باہر ہر اس شخص سے جنگ کرنے کا اختیار حاصل ہے جو زمام اقتدار اس کے حوالہ نہ کرے اگر چہ اس کے لئے یہ بھی جائز ہے کہ وہ بعض ممالک سے معاہدہ کرلے اور باہمی معاہدے کے ذریعہ اپنے اس اقتدار کو محدود کرلے جو بنیادی طور پر ہمہ گیر ہے (۲)۔ اس خیال کی بنیاد یہ مفروضہ ہے کہ سورج اپنے پرستاروں کو ان تمام چیزوں پر اقتدار و حکمرانی عطا کر دیتا ہے جن پر اس کی کرنیں پڑتی ہیں جیسا کہ فرعون مصر کے سلسلہ میں کہا جاتا ہے۔

جہاں تک عیسائیت کا تعلق ہے تو اس کے موقف کو اس کے دو دھڑوں پر غور کرکے سمجھا جاسکتا ہے: ایک "مشرقی عیسائیت"، دوسری "یہودی عیسائیت"۔ موخر الذکر گروپ اپنے کو دین

---

۱- ملاحظہ ہو: نظم القانون الرومانی (۱/ ۱۱۴) باو فا، ۱۹۴۷ء۔

۲- اس سلسلہ میں ملاحظہ کی جائے: بیترو ڈیفرانشی کی کتاب "أسرار الامبراطوریات" روما، ۱۹۷۰ء، ۱/ ۱۵۱-۱۵۲۔

یہود یعنی ''اللہ کی پسندیدہ قوم کے مذہب'' کے اندر ایک اصلاح پسند تحریک قرار دیتا ہے۔اس سلسلہ میں اس کی منطق اس اصول پر مبنی ہے:''**لیس علینا فی الأمیین سبیل**''(آل عمران:۷۵) (غیر یہودی لوگوں) کے معاملہ میں ہم پر کوئی مواخذہ نہیں ہے)۔یہی ''یہودی عیسائیت'' ہے جو آج امریکہ میں "Judeo-Christian" کے نام سے معروف ہے اور اپنے کو مغربی عیسائیت قرار دیتی ہے۔اس نے ''یہودی عیسائیت'' کی تعلیمات کی روشنی میں رومی شہنشاہیت کی مرکزیت یا اس کی عالم گیریت کے متبادل کے طور پر ایک عالمی سماج کی تشکیل کا تصور رومیوں اور رومی شہنشائیت سے اخذ کیا ہے۔

کلیسا ایک حکومت کی داغ بیل ڈالنے میں کامیاب ہوگیا اور اس نے یہ چاہا کہ بعد میں اپنی ایک حکومت یا متعدد حکومتوں سے ایک عالمی حکومت تشکیل دے مگر اس سلسلے میں بے شمار مظالم اور خون خرابہ کرنے کے باوجود اسے کامیابی نہیں ملی یہاں تک کہ سولہویں صدی عیسوی میں اصلاح کی پروٹسٹنٹ تحریک ظہور میں آگئی جس کا مقصد کلیسا کو اس کے اختیارات سے بے دخل کرنا اور ایک ایسے متحدہ عالمی سماج کی تشکیل سے متعلق اس کے خوابوں کو چکنا چور کرنا تھا جس کی باگ ڈور ایک کلیسا اور ایک تاج یا متعدد یوروپی تاجوں کے حوالہ ہوتی،لیکن جلد ہی ان کلیسائی خوابوں کی وارث یوروپ کی اہل فکر و دانش قیادتیں ہوگئیں اور اس میں وہ سیاسی قیادتیں بھی شامل ہوگئیں جن سے یورپ کی روشن خیالی کی تحریک (Enlightenment Movement) نمودار ہوئی،لیکن ان تمام تر کوششوں نیز ان سے متعلق مذہبی افکار اور روشن خیال ذہنیت کے درمیان ایک بنیادی چیز میں اتفاق تھا یعنی یہ کہ یوروپی تشخص کو مرکز و محور اور ایک طاقت کے طور پر دیکھا جائے اور اس کے علاوہ دوسروں کو ثانوی حیثیت دی جائے،انہیں دودھ اور شہد کے ذخائر اور ایسی منڈیاں تصور کیا جائے جن کے لئے یوروپی مرکز و محور کے گرد گھومنا اور اس کی بالادستی کے مفاد میں استعمال ہونا لازم قرار دیا جائے۔

اس طرح انسانیت ، دنیا اور عالمی تصور سے متعلق روشن خیال قیادتوں کے افکار و خیالات کا مفہوم اس کے سوا کچھ نہ تھا۔اگر ایک طرف کلیسائی بنیادوں پر مبنی ''عالم گیریت'' کا تصور ناکامی سے دوچار ہوا جیسا کہ عقلیت اور روشن خیالی پر مبنی تصور عالم گیریت ناکام ہوا تھا تو دوسری طرف یورپ نے یوروپی عیسائیت کے ذیل میں رومانزم (Romanism) یا رومانٹسزم (Romanticism) کو ایک فکری دھارے کی حیثیت سے متعارف کرانے میں اس کو ایک قسم کی جدیدیت قرار دیا کہ حق اور اقدار کو عقلی و فکری رخ دینے کے بجائے جذباتی اور انفعالی رخ دیا جائے۔اس کے نتیجہ میں یہ تہذیبی تحریک دین و اخلاق کو ایسی جذباتی بنیادیں فراہم کرنے میں کامیاب ہوگئی جن پر ان کا ارتکاز ہو، تاکہ اس کے ذریعہ عقلیت اور حسیت کے اعتراضات سے بچا جاسکے۔اسی طرح قومی بنیاد پر کسی پارٹی کے لئے وفاداری کا جذبہ کا استعمال کر کے قوت کے سرچشمہ کو طبقہ امراء کے لئے محفوظ کر دیا گیا۔یہ قومی بنیاد شخصی مرکزیت کو ان تصورات کی تشکیل سے متعلق بنیادی عناصر کی حیثیت سے قوت فراہم کرتی تھی جن پر بعد کے دور میں قومیت کی عمارت تعمیر ہوئی جیسے ''مفادات عامہ'' کا تصور جس کو سربراہ یا قوم سے وفاداری کے ساتھ ساتھ ''سیاسی پارٹی'' کے شخصی مفادات سے جوڑ دیا گیا۔

اب ''سیاسی گروپ'' کا تصور واضح اور نمایاں ہونا شروع ہوا جو ایک قسم کی ''ریاست پرستی'' (Stateism) پر منتج ہوا۔اسی ''ریاست پرستی'' نے اپنی طرف سے حریف حکومتوں کے قیام کی راہ ہموار کی۔ان حکومتوں کی طرف سے کی جانے والی ہر قسم کی کوششوں کا محور ''قوم پرستانہ مصالح'' یا ''مفادات عامہ'' کی خدمت تھی جس کو بیش تر ''یہودی عیسائیت'' کے کلیسا نے یہودی اور عیسائی دونوں مذاہب میں صریحی طور پر حرام قرار دیئے گئے ''ربا'' (سود) کے لین دین کو جواز عطا کرنے کے لئے بنیاد بنایا، لیکن پندرہویں صدی میں مذہبی طبقہ نے جب یہ محسوس کیا کہ ترقی اور خوش حالی ایک عظیم مقصد ہے اور تاجر کا مقام اور اس کا پیشہ بڑی اہمیت کے حامل ہیں، کیونکہ

ملکوں کی ترقی، ان کا عروج اور ان کی خوش حالی تاجروں پر قائم ہے، تو انہوں نے اس میں ڈھیل دینی شروع کی (۱)۔

چونکہ ''ادارہ جاتی مغربی مسیحیت'' کے علم بردار مغربی کلیسا نے ''ترقی'' کے تصور کو ایک ایسے عالم گیر روحانی پیغام میں سمو دیا تھا جس کی زمانی اور تاریخی جڑیں صلیبی جنگوں (۱۰۹۶-۱۲۹۱) میں پیوست تھیں، اس لئے ایک بار پھر وہ یورپی عزائم یعنی تورات پرست کلیسا اور اقتدار وقت کا اشتراک عمل میں آیا تا کہ تسلط اور بالادستی بھی حاصل کی جائے اور مشرق میں موجود اسلام جیسے رجعت پسند مذاہب سے چھٹکارا بھی مل جائے (۲)۔ اب تاجروں اور مبلغین کے گروپ ایک ساتھ اور پہلو بہ پہلو متحرک ہو گئے۔ ان کو کوشش یہ تھی کہ دوسروں کے طرز زندگی اور ان کی ذہنیتوں کو تبدیل کیا جائے، یوروپی مصنوعات کے لئے منڈیاں قائم کرنے کی غرض سے ان کے سماجی اور اقتصادی ڈھانچوں کو تباہ و برباد کیا جائے، ملک کے حقیقی باشندوں کے سرمائے لوٹ لئے جائیں، تاریکیوں میں بھٹک رہے ان کافروں کے خام مال پر قبضہ کرلیا جائے، ان کی گمراہ مذاہب پر بندش لگائی جائے اور انہیں روشن خیال اور روادار عیسائیت کی راہ دکھائی جائے۔

---

۱- ملاحظہ ہو غریغوار مرشو کی کتاب: ''مقدمات الاستتباع'' طبع المعھد العالمی للفکر الاسلامی، ۱۹۹۶ء، ص ۲۸۔

۲- ۱۹۱۱ء میں لیبیا کے شہر طرابلس پر فوجی حملہ کے دوران ایک اطالوی قصیدہ میں جو مضمون پیش کیا گیا تھا، اس کا ترجمہ یوں ہے:

''پیاری ماں! تم اپنی عبادت پوری کرو، رو مت بلکہ ہنسو اور غور کرو، کیا تمہیں معلوم نہیں کہ اٹلی مجھے پکار رہا ہے، یہ دیکھو! میں خوش و خرم طرابلس جارہا ہوں تا کہ ایک ملعون قوم کو کچلنے اور اسلام مذہب سے جنگ میں اپنا خون صرف کردوں جو کنواری لڑکیوں کو بادشاہ کے لئے مباح قرار دیتا ہے، میں اپنی پوری قوت سے قرآن کو مٹانے کے لئے جنگ کروں گا......''

ملاحظہ ہو: شکیب ارسلان، لماذا تأخر المسلمون وتقدم غیرھم؟ بیروت، دار مکتبۃ الحیاۃ، ۱۹۶۵ء، ص ۵۲۔

لہذا ان کی نظر میں مشرق کی تاریکی کے لئے اس کے سوا کوئی صورت نہیں کہ وہ مغرب سے آنے والی روشنی کو قبول کرے تا کہ کافر اور بت پرست احمقوں، وحشیوں اور غیر مہذب لوگوں پر تہذیب کی حکمرانی ہو جو اس محمد کی ہدایات کی بنا پر حجر اسود کی پوجا کرتے ہیں جس کی طرف یہ لوگ نبوت و رسالت کی نسبت کرتے ہیں، اسی طرح ان کی افترا پردازیوں پر قدغن لگائی جا سکے۔

اسی طرح مارٹن لوتھر جو ایک ایسا مذہبی اصلاح پسند مانا جاتا ہے جس نے پاپائی کلیسا کے خلاف پروٹسٹنٹ ازم کا علم بلند کیا، اسلام کا مطالعہ کرنے اور اس سے بہت کچھ سیکھنے کے بعد کہتا ہے:

''روح القدس کے تقاضے اور قانون مسیح کے نام سے مطابقت رکھنے والا روحانی محرک عیسائیوں کو سب سے بہتر افراد قرار دیتا ہے، جہاں تک زمانی محرک کا تعلق ہے تو وہ غیر عیسائیوں اور شر پسندوں کے لئے سد راہ ہے، کیونکہ وہ خارجی پابندیوں کے دباؤ کے تحت خواہی نخواہی امن کا احترام کرنے اور جمود سے چپکے رہنے پر مجبور ہیں''۔

اور جب حکومت کا اپنے اختیار کو استعمال کرنا اور تلوار نکالنا رب کی خدمت کے لئے ہو تو تلوار کی نوک پر حکومت کرنے کے لئے اقتدار کے جو تقاضے ہیں ان کی تکمیل بہر حال ہونی ہے تا کہ رب کی خدمت کے حکم کی تعمیل ہو سکے اور سبب خواہ کچھ ہو ایسے شخص کا پایا جانا فرض ہے جو شر پسندوں کو گرفتار کرے، ان پر مقدمات چلائے، ان کو ذبح اور قتل کرنے کا فریضہ انجام دے سکے، لیکن اسی کے بالمقابل نیک افراد کو کسی ایسی کاروائی سے روکنا اور محفوظ رکھنا بھی ضروری ہے جس کے ذریعہ وہ ان کی طرف سے دفاع کریں اور ان کو تحفظ دلانے کی کوشش کریں(۱)۔

---

۱- ذرا ریاست ہائے متحدہ امریکہ کے صدر کے اس فیصلہ پر غور کیجئے جس کے تحت ان کے بقول اب ان ممالک کو حملوں کا نشانہ بنایا جائے گا جو ''بدی کا محور'' (Axis of Evil) ہیں، یہ فیصلہ ان توراتی اور تلمودی تعلیمات سے کس قدر ہم آہنگ ہے!!

## مغربی تسلط:

پروفیسر غریغوار مرشو، اسی طرح شہید اسماعیل فاروقی، ڈاکٹر عبد الوہاب مسیری، پروفیسر محمد ابوالقاسم اور ڈاکٹر یوسف الحسن ہمیں وضاحت سے بتاتے ہیں کہ ایک دوسرے سے حد درجہ مختلف اجزائے ترکیبی کو ملا کر ایک ایسا معجون مرکب تیار کرنا کس طرح ممکن ہوا جو اس کیتھولک کلیسا، تورات، تلمود اور پروٹسٹنٹ ازم پر مبنی رویوں یا پیشن گوئیوں بلکہ سیکولر رجحانات، عقل پرستانہ خیالات، رومانزم، اضافیت، تجارتی مقاصد، ڈاکہ زنی کے مجرمانہ میلانات، علمی اور فلسفیانہ لادینیت نیز امراء اور حکام کے عزائم اور منصوبوں کی مشخص اور مجسم صورت میں موجود ہے۔ آخر ان باہم متضاد اور متناقص عناصر سے ایک ایسا یوروپی خمیر کیوں کر تیار ہو سکا جس کے تحفظ، دیکھ ریکھ اور ترویج و اشاعت کی مہم مشرق میں سرمایہ داروں، مہم جوؤں، دولت و شہرت کے حریص عسکریت پسندوں، یونیورسٹیوں کے ملازمین، مستشرقین اور اہل کلیسا کے اشتراک سے تشکیل شدہ ایک متضاد گروپ سر انجام دے(۱)۔

جہاں تک اہل فکر اور نظریہ ساز فلاسفہ کا تعلق ہے تو وہ یورپ کی نشاۃ ثانیہ کے ابتدائی دور ہی سے ان کارروائیوں کی نظریہ سازی کرنے اور ان کو مغربی قانونی قالب عطا کرنے میں مصروف تھے جو یہ عجیب الخلقت گروپ انجام دینے والا تھا تاکہ فطرت اور انسان کی تسخیر کے بعد غیر مغربی انسان کی عقل پر بھی ان کا تسلط قائم ہو جائے یا عقل پر کنٹرول کے ذریعہ فطرت اور انسانیت پر کنٹرول کی راہ ہموار ہو۔

---

۱- ملاحظہ ہو: مقدمات الاستتباع لغریغوار مرشو طبع المعہد العالی للفکر الاسلامی، ۱۹۹۶ء اسی طرح ڈاکٹر عبد الحمید ابوسلیمان کی کتاب "النظریۃ الاسلامیۃ العامۃ للعلاقات الدولیۃ" پر اسماعیل فاروقی کا مقدمہ، اسی طرح یوسف الحسن کی کتاب "البعد الدینی فی السیاسۃ الأمریکیۃ" طبع بیروت، مرکز دراسات الوحدۃ العربیہ، ۱۹۹۰ء، نیز موسوعۃ الیہود والیہودیۃ والصہیونیۃ" پر ڈاکٹر عبد الوہاب مسیری کے مقدمے، قاہرہ، دار الشروق، ۱۹۹۸ء اور محمد ابوالقاسم "العالمیۃ الاسلامیۃ الثانیۃ" بیروت دار ابن حزم، ۱۹۹۶ء۔

اس سے پہلے فکری کوششوں کا آغاز ''میکاولی'' اوراس کے ان افکار سے ہو چکا تھا جو اس نے اپنی تقریروں اور اپنی کتاب "The Prince" میں پیش کیے تھے، ''ہوبس'' نے مذہب، ریاست اور علم سے متعلق میکاولی کے خیالات کی تائید کی، پھر ڈیکارٹ اوراس کے ہم خیالوں کا اوراس کے بعد ''ہیگل'' اوراس کے مکتب فکر کا دور شروع ہوا۔ان افکار و خیالات کا خلاصہ یہ تھا کہ مشرق کی نجات اسی آزادی میں ہے جو مغرب کی طرف سے اس کو عطا کی جائے۔ اسی طرح عقل کا وجود مغربی معیارات واقدار اور مغربی مکاتب فکر کے طور طریقوں سے ہم آہنگ ہوئے بغیر ممکن نہیں ہے۔چنانچہ مغربی علم اور مغربی فلسفہ نے اس مثالیت پر مبنی تاریخ کے دائمی خدوخال متعین کیے جس کے محور پر تمام اقوام کی تواریخ کا اپنی تخلیق کے ابتدائی عہد نیز اپنی ترقی اور عروج کے دور سے لے کر اپنے زوال وانحطاط کے زمانہ تک گھومنا مثالی قرار پایا(۱)۔

زمانہ ماضی میں انسانوں کی درجہ بندی اوران کے درمیان امتیاز کے رجحانات سادہ اور معمولی قسم کے خیالات پر مبنی ہوا کرتے تھے اوران کا رد کرنا، ان کا ازالہ کرنا اوران کی مذمت کرنا آسان ہوتا تھا، اس کے بعد کے عہد میں مغربی مفکرین کی کوششوں نے ان رجحانات کو فلسفیانہ رخ دے کر ایک ایسی علمی اور ادارہ جاتی ترتیب وضع کی جس کا اپنا ایک فلسفہ ہے، اپنے مناہج ہیں، اپنے وضع کردہ نظریات اور معیاری احکام ہیں۔اس مرتبہ میں ان کا مقصود یہ تھا کہ وہ اپنے پیش کردہ انسانی اور سماجی علوم وفنون کے ذریعہ دیگر تہذیبوں کے ماننے والوں خصوصاً مشرقی تہذیب کے علمبردار عربوں، مسلمانوں اور مشرقی کلیساؤں کو منفی نام دے سکیں۔اس طرح پورا مشرقی استبداد، پس ماندگی، لاپروائی، سستی، احمقانہ جذباتیت، خرافات، جادو، شعبدہ بازی، غیر عقلیت اور غیر تاریخیت کی آماج گاہ قرار پایا۔ایسا مختلف مقاصد کے حصول کے لئے کیا گیا، ان مقاصد میں سے ایک مقصد یہ تھا کہ خود عربوں اور مسلمانوں کے اندر ایک ایسا منتخب گروپ

---

۱- حوالہ سابق، ص ۸۳۔

"Elite" پیدا کر دیا جائے جس کی پرورش و پرداخت ان افکار پر ہوئی ہو تا کہ ایک طرف تو ان کے ذریعہ ان افکار کے داخلی مبادیات تشکیل دیئے جاسکیں اور دوسری طرف مسلم اقوام کے خلاف مغربی حکومتوں کے سامراجی اور توسیع پسندانہ رجحانات کو مغربی باشندوں کی تائید وحمایت حاصل ہو سکے اور ان کے خلاف ہر قسم کے ظلم وجبر، استعماریت، استحصال اور غلام بنانے کی پالیسیوں کو سند جواز عطا کی جاسکے۔

اسی طرح ''خدائی تحفظ ونگہبانی'' کے مغرب پرست نمائندے جن اقوام کو آزاد و تیار کر کے جدیدیت کے قافلہ میں شامل کرنا چاہیں ان سے متعلق ان کی کوششوں پر ''آزادی'' اور ''نجات'' کا لیبل لگایا جاسکے۔

## انسانوں کی درجہ بندی میں انسانی اور سماجی علوم کا کردار:

ان علوم کی تشکیل کی تحریک شروع ہوئی جو بعد میں مغربی، انسانی اور سماجی علوم میں تبدیل ہو گئے لیکن ان پر عالم گیریت کا لیبل چسپاں کیا گیا، مثال کے طور پر ''علوم انسانیت'' اور ''علوم لسانیات'' جن کا استعمال مغرب کے اہل علم اور مستشرقین نے تاریخ اور انسانی حالات کی نسلی تعبیرات کا قصر تعمیر کرنے میں کیا، پھر اسی تصور کے ساتھ ساتھ ان ہی جیسے مقاصد کی تکمیل کے لئے اور ان ہی نظریات کے مطابق ''علم نفسیات'' کی بنیاد ڈالی گئی۔ اسی طرح یوروپی ''علم جغرافیہ'' کے بنیادی اصول تشکیل دئے گئے تا کہ اسے تصور ''شہریت'' کے ضروری توازن کو بروئے کار لانے والے کلیدی علوم میں سے ایک تسلیم کیا جائے۔ اس کے ساتھ ساتھ یوروپی علم مسلسل تمام علوم: سیاسیات، سماجیات، اقتصادیات، انتظامیہ، قانون، فنون اور آداب کی تشکیل کرتا رہا تا کہ انہیں بعد میں تمام اقوام عالم میں عام کیا جاسکے اور ''اور جدید مغربی کائنات'' یا ''یہودی عیسائیت'' پر مبنی یوروپی مرکزیت کو عملی صورت عطا کر کے اسے ایک ایسی ''معاصر عالم گیریت'' میں تبدیل کر دیا جائے جو خود یورپ کے بقول ''عالمی نظاموں'' پر حاوی ہو اور جب

چاہے، جس طرح چاہے اپنی مرضی دوسروں پر تھوپ سکے۔ اس طرح اس عالم گیریت نے اسی صدی میں پہلی عالمی جنگ کے بعد اپنا عالمی نظام قائم کیا پھر اس نے دوسری عالمی جنگ کے بعد دوسرا عالمی نظام جنم دیا اور دنیا کو تین حصوں میں تقسیم کر دیا: پہلی دنیا لبرل مغرب کی تھی، دوسری مرحوم سویت یونین کی اور تیسری مسلمانوں اور ان سے وابستہ اقوام کی۔ اس مرحلہ میں مغرب کی مہارت نے ان تمام تعصّبات سے پر ''بین الاقوامی تعلقات کا علم'' متعارف کرایا جو سرد جنگ کا باعث بنے تھے اور جن کے نتیجہ میں ہزاروں ایسی چھوٹی اور محدود سطح کی جنگیں برپا ہوئیں جنہوں نے مغرب کو چھوڑ کر دنیا کے تمام ملکوں کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ ان تمام جنگوں کی تحریک پیدا کرنے والا اور ان سے سب سے پہلے فائدہ اٹھانے والا مغرب ہی تھا۔ ان ہی تعصّبات نے بالآخر ''جارج بش'' کے تیسرے یا نئے عالمی نظام کو نمایاں کرنے میں مدد دی جو اس وقت جونیر جارج بش انتظامیہ اور اس کے باپ کے سابق اعوان و انصار کی زیر نگرانی بین الاقوامی تعلقات، بین الاقوامی قانون اور دیگر شعبوں میں دور رس تبدیلیاں کرنے کا نشانہ رکھنے والے افکار و خیالات کے اشتراک سے اپنا ڈھانچہ تشکیل دے رہا ہے۔

## عالم گیریت کا اسلامی تصور:

دور حاضر میں بین الاقوامی تعلقات سے متعلق نقطہ نظر کی تشریح اور اس کے نتیجہ میں ظہور پذیر ہونے والے بقائے باہم کی وضاحت ایک شرعی ضرورت بلکہ ہماری امت کی بقاء اور وجود کی ضرورت ہے۔ ہماری امت اب بھی ایسے حملوں اور یورشوں کا نشانہ بنی ہوئی ہے جن کا مقصد امت کی تہذیب کو بیخ و بن سے اکھاڑ پھینکنا اور اس کے علمی نظاموں کا کلی صفایا کر دینا ہے۔ اب جب کہ ہمارے اہل علم اور اہل فکر کی ایک مختصر تعداد نے مغربی فکر سے قریب یا اس سے موازنہ اور تقابل کے مراحل کو عبور کرنا شروع کر دیا ہے(۱) اور بعض نے تو ''مغرب کے علمی نظام''

---

۱- ہم کہہ سکتے ہیں کہ مغربی فکر سے ''قربت کا تصور'' ۱۷۹۸ء میں مصر پر نپولین کے حملہ سے شروع ہو کر عالم عرب

پر نقد کرنے اور اسلامی متبادل پیش کرنے کی بھی جرأت کی ہے(۱)، ان کی کوششوں کا مقابلہ ایک ایسی جوابی اور شدید مہم سے ہے جو استشراق اور ماقبل استشراق کے سرمایے سے ماخوذ و مستفاد ہے۔ اس کی رو سے مغربی فکر سے پیدا شدہ سرمایہ دارانہ یا اشتراکی نقطۂ نظر کے بالمقابل، اسی طرح اپنی متعدد اندرونی تقسیمات مثلاً لبرل ازم سمیت دیگر سیکولر نظریات کے متبادل کے طور پر ایک ''قرآنی علمی نظام'' کی تشکیل ناممکن ہے، اس لئے اسلامی علمی جدوجہد کو مسلمانوں کی دیگر ترجیحات پر مقدم رکھنے کی ضرورت ہے تاکہ موجودہ صورت حال میں اسے قیادت کا مقام حاصل ہو اور اس حقیقت کو ثابت کیا جائے کہ دنیا اس وقت تک امن و سلامتی اور خوشی و اطمینان سے ہمکنار نہیں ہو سکتی جب تک پوری انسانیت اسلام میں پوری طرح داخل نہ ہو جائے اور اس کو واضح کیا جائے کہ انسانیت کو ان خطرناک امراض سے بچنے کا رخ اپنانا ہوگا جن سے مغربی علوم و فنون بھرے پڑے ہیں۔ یہی مغربی علوم معاصر دنیا کی ذہنیت اور نفسیات پر پوری طرح مسلط ہیں اور ان ہی سرطانی جراثیم سے ملوث کر کے اس کی شخصیت کو ڈھال رہے ہیں۔

ان علوم نے جو مسائل پہلے پیدا کئے ہیں اور اب بھی کرتے آ رہے ہیں، وہ بڑے گمبھیر ہیں۔ یہ دہشت گردی اور بے چینی تو محض اس کے چند مظاہر ہیں، اب تو زمام خود مغرب کے ہاتھ سے بھی نکل چکی ہے۔ اس وقت تو ان کے انصاف پسند مفکرین بھی زوال کے پہیے کو قابو میں کرنے کی پوزیشن میں نہیں رہ گئے ہیں، کیونکہ بحران کائناتی ہے اور انتشار ہمہ گیر ہے۔ اس لئے کسی ایسی معجزاتی اور کائناتی کتاب کی ضرورت ہے جو ہر قسم کے نقص و غلطی سے مبرا اور حدود و قیود سے بالاتر ماخذ سے پیش کی جائے۔ اسے یہ معلوم ہو کہ علوم انسانیات اور لسانیات کے افسانوں نے نسلی اور عنصری افسانوں کے جو محلات تعمیر کئے ہیں انہیں کس طرح زمین بوس کرنا ہے، نیز یہ

---

میں ''الاخوان المسلمون''، برصغیر میں ''جماعت اسلامی'' اور فلسطین و اردن میں ''حزب التحریر'' کی تشکیل تک باقی رہا۔ ان تحریکات کے ظہور کے بعد مغربی فکر کے موازنہ اور تقابل کا عہد شروع ہوا۔

۱- یہ دور ''علوم کو اسلامیانے'' (اسلامائزیشن آف نالج) سے متعلق افکار و مبادیات کی تشکیل کا ہے۔

کہ انواع کی اصل واساس کیا ہے تا کہ انسانیت کا اپنے پیدا کرنے والے نیز وحدت انسانیت اوراس کائنات کی وحدت پر دوبارہ ایمان بحال ہو جس میں وہ رہ رہی ہے اور پوری انسانیت کے درمیان ازسرنو فطری روابط کی تشکیل جدید ہو سکے۔ان روابط میں ''بین الاقوامی تعلقات'' شامل ہیں جن کی اساس اور جن کا سرچشمہ ''قرآن مجید'' کے سوا کچھ نہیں ہے۔کیونکہ قرآن مجید ہی وہ واحد کتاب ہے جس نے ایسی حتمی قطعیت کے ساتھ جس میں نہ کسی تاویل کا امکان ہے اور نہ اس کی تعبیر میں انحراف ممکن ہے،تمام انسانیت کی وحدت پر زور دیا ہے۔اسی طرح قرآن نے زمین کی وحدت پر اس حیثیت سے زور دیا ہے کہ وہ تمام اولاد آدم کے لئے مسکن اور وطن ہے،خواہ وہ گرم ہو یا سرد،خط استواء پر ہو یا دیگر خطوط پر،مشرقی ہو یا مغربی،جس طرح اس نے چند ایسے عظیم شرعی مقاصد اور اقدام پر زور دیا ہے جن کی حکمرانی تمام انسانی تعلقات پر ہوتی ہے۔انسانی کردار کے تمام پہلوؤں کا رخ مندرجہ ذیل بنیادی اقدار میں جلوہ گر خط مستقیم کی طرف موڑا جاسکتا ہے:

۱-توحید

۲-تزکیہ

۳-عمران

ان تین اقدار یا مقاصد پر چند دیگر ایسے مقاصد مبنی ہیں جو اصول ''عالم گیریت'' کی اصل واساس ہیں،وہ یہ ہیں:

۱-انصاف

۲-آزادی

۳-مساوات

عالم گیریت کے ان اصولوں سے متعدد شاخیں نکلی ہیں۔ان ہی مضبوط ستونوں پر

کائنات میں انسانیت کی تفویض خلافت، امانت کی سپردگی، حق ابتلا کی انجام دہی اور نعمت تسخیر کا استحقاق مبنی ہے۔ ان سب کا مقصود یہ ہے کہ انسان اللہ تعالی کے ساتھ کئے گئے اپنے عہد کو پورا کرے اور تسبیح، عبادت اور تعمیر کے مبارک خطوط پر کائنات کی قیادت کرے، حقوق اللہ اور حقوق العباد کی توضیح وتشریح ہو، اسی طرح فرد اور جماعت کے حقوق کا تعین ہو۔

نزول قرآن سے قبل کے عہد میں رائج اور جادۂ حق سے ہٹے ہوئے ان تعلقات و تصورات کے باوجود قرآن مذکورہ مبادیات کے ایک اجمالی نقشہ کی تشکیل وتاسیس میں کامیاب ہوگیا تاکہ ان کی بنیاد پر انسانیت کا قدم ایک مدت بعد ہی سہی اس مطلوبہ عالم گیریت کی سمت میں اٹھے جس کے سایہ تلے تمام لوگ پوری طرح اسلام میں داخل ہوجائیں۔

## ہدایت اور حق کی عالم گیریت:

اسلام سے قبل جیسا کہ تفصیل گذری، عالم گیریت ہیلینیوں(Hellenians) اور رومیوں(Romans) کے ہاتھوں انسان کے ذریعہ انسان پر ان روایتی جبر واستبداد کے فلسفوں کے تناظر میں تھوپی گئی جو روئے زمین کی تمام اقوام میں رائج تھے۔ اسی طرح اسلام تمام قدیم تہذیبوں کے گہوارہ میں پھیلا اور اس کی تعلیمات کے ستونوں پر ''مسلمانوں کی پہلی عالم گیریت'' کی بنیاد پڑی اور یورپ نے اپنی عالم گیریت کی بنیاد روشنی منشا ۃ ثانیہ اور عقلیت پرستانہ فلسفوں پر رکھی جن میں سے بعض کی خصوصیات اور ان سے ملتے جلے نقائص اور کمزور پہلوؤں کی طرف ہم پہلے اشارہ کرچکے ہیں۔ آج دنیا ایک ایسی مطلوبہ ''عالم گیریت'' کی منتظر ہے جو صرف ان مشترک اقدار کے سایہ ہی میں وجود پذیر ہوسکتی ہے جن کے ستونوں کو اسلام نے حضرت ابراہیم علیہ السلام سے لے کر حضرت محمد ﷺ کے طویل ترین عہد تک مضبوط و مستحکم کیا ہے۔ سوال یہ ہے کہ وہ مطلوبہ عالم گیریت کیسے بروئے کار لائی جاسکتی ہے جس سے انسانیت اپنی وحدت کی طرف پلٹ آئے اور اس طرح وہ خاتمہ (End) فنا، لغویت، تاریخ اور کائنات کے اختتام سے

متعلق فلسفوں اور نظریات کے انجام بد سے محفوظ ہو جائے؟

قرآن کریم عربوں کی زبان میں اور ان ہی میں کے ایک رسول پر نازل ہوا، محترم شہر میں اس کے نزول کی ابتدا ہوئی۔ رسول اللہ ﷺ کے دوسرے دار الہجرۃ "مدینہ" میں اس کا نزول مکمل ہوا اور اسی پر دین کی تکمیل ہوئی۔ عرب اس قرآن کو قدیم تہذیبوں کے مراکز تک پہنچانے کے لئے نکلے، ان کا یہ نکلنا نہ اپنی طرف سے تھا اور نہ شخصی نوعیت کا تھا، یہ نکلنا ان کا مزاج بھی نہیں تھا، لیکن اللہ انہیں ایک الٰہی تحریک کے تناظر میں نکالا نہ کہ قومی و شخصی تسلط اور ربالادستی کے حصول کی غرض سے۔ ان کا تعلق قران اور اس میں مضمر پیغام سے تکلیف (حکم کا پابند بنانا)، تعمیل اور تسلیم کی نوعیت کا تھا، نہ کہ اپنی طرف سے ایجاد اور نئی چیز پیدا کرنے کے قبیل سے۔ پیغام اسلامی کے اولین علم بردار دو مہمیں سر کرنے کے لئے نکلے تھے: ایک "دعوت الی اللہ" اور دوسری "امر بالمعروف و نہی عن المنکر"، "كنتم خير أمة أخرجت للناس تأمرون بالمعروف وتنهون عن المنكر وتؤمنون بالله" (آل عمران:۱۱۰) (اب دنیا میں وہ بہترین گروہ تم ہو جسے انسانوں کی ہدایت اور اصلاح کے لئے میدان میں لایا گیا ہے، تم نیکی کا حکم دیتے ہو، بدی سے روکتے ہو اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو)۔

حقیقت میں یہ پیغام چند ایسے انسانی مقاصد کی تکمیل کی دعوت ہے جو تمام انسانوں کے درمیان مشترک ہیں۔ اس دعوت کا خلاصہ یہ ہے کہ لوگوں کو پروہتوں، سرکشوں، فرعونوں، کسروی شہنشاہوں، لیڈروں اور ان اداروں کے چنگل سے نکال کر صرف اور صرف اللہ تعالی کی طرف لایا جائے، مذاہب کے ظلم و ستم سے بچا کر اسلام کے عدل و انصاف سے نوازا جائے اور دنیا کی تنگی سے نجات دلا کر دنیا اور آخرت کی وسعت سے ہم کنار کیا جائے۔ ان تمام چیزوں کا فائدہ بالآخر ان تمام لوگوں کو پہنچے گا جو اس پیغام کے مخاطب ہیں۔ ایسے ہی قومی یا شخصی مفادات سے پاک اور دوسروں کے مصالح کو پیش نظر رکھنے والے پیغام کے نتیجہ میں دوسرے افراد کو، ان

کی تہذیبوں کواوران کے ثقافتی نظاموں کواپنے اندر سمونے، نیز انہیں اس پیغام کے اختیار کرنے اوراس امانت کودوسروں تک پہنچانے میں برابر کا شریک بنانے کی استعداد پیدا ہوئی۔ابھی اس دعوت کے آغازاوراس پیغام کی تبلیغ پرصرف چند دہائیاں ہی گزری تھیں کہ اسلام نے اپنی کرنوں سے اس وقت کی معلوم دنیا کے نصف جنوبی حصہ کومنور کردیا یعنی مشرق میں چین کے جنوب سے لے کرمغرب میں یوروپ کے جنوب تک۔اسلام بت پرست اقوام مثلاً عربوں، مغلوں، ترکوں، کردوں، بربراوران کے علاوہ دیگر اقوام عالم کوفتح کی ایک ایسی تحریک اور ہمہ گیر دعوت میں شامل کرنے میں کامیاب ہوگیا جواس وقت کی دنیا میں رائج تعلقات کے نظام اورمزاج کے دائرہ میں برپا ہوئی تھی۔جہاں تک اہل کتاب قوموں کا تعلق ہے توان میں سے جولوگ بھی مسلمانوں کے ساتھ عقد ذمہ (حفاظت کا معاہدہ) میں شامل ہوئے، ان کے قومی تشخصات اوران کے مذہبی اورثقافتی امتیازات کا تحفظ کیا گیا اوران کواپنایا گیا، شام کی رومی سامراجی حکومت اوراسی طرح ایرانی شہنشاہیت کا خاتمہ ہوگیا۔قدیم تہذیبوں کے تمام مراکز اسلام کے نور سے منور ہوگئے اور مسلمانوں کی حکومت ''پہلی عالم گیر سلطنت'' بنی۔

اسلام نے اس کے ذریعہ مشرق ومغرب کے دوہرے پن سے نمٹنے میں کامیابی حاصل کرلی۔اسی طرح اہل اسلام تمام مختلف مذہبی، ثقافتی اورتہذیبی وحدتوں کو''اسلامی پیغام کی عالم گیریت'' کے دائرہ میں سمولینے پر قادر ہوگئے۔اگر معاصر تہذیب کا نقطۂ کمال تکثیریت (Pluralism) کوتسلیم کرنا ہے تو''اسلامی پیغام کی عالم گیریت'' کا کمال یہ ہے کہ اس نے ماضی وحال ہر زمانہ میں نہ صرف تکثیریت کوتسلیم کیا ہے بلکہ اسے اپنانے کے ساتھ ساتھ عالم گیریت کی سمت میں متحرک وفعال بھی بنایا ہے تاکہ وہ مثبت انسانی تنوع کے دائرہ میں ایک متحرک عنصر کی شکل اختیار کرلے اوراس پر ہدایت اوردین حق کے وہ انوار سایہ فگن ہوں جومذہبی یا فرقہ وارانہ دھڑے بندی کے کسی سبب یا محرک کے پیدا ہونے کے روادار ہی نہیں۔اسلام نے

اپنے اندر جذب وکشش کا محور رکھا ہے نہ کہ مغرب کی معاصر اور مغرور مرکزیت کی طرح ترک تعلق اور افتراق کا، اسی طرح اس نے اپنی برپا کردہ امت کو متحد کرنے والا اور دوسروں کو اپنے اندر سمونے والا مرکز بنایا ہے۔

سورۂ توبہ، سورۂ فتح اور سورۂ صف کی وہ تین آیتیں جن میں ہدایت اور دین حق کے تمام ادیان پر غلبہ کا وعدہ مذکور ہے، غلبہ میں معاون اہم خصوصیات کی یاددہانی کرتی ہیں، یعنی حق کی تلاش وجستجو اور اس کے لئے تگ ودو، کیونکہ دین حق کی طرف منسوب ہے اور حق دین کی طرف۔ ان آیات میں لفظ اسلام کا استعمال نہیں کیا گیا ہے:"**هو الذى أرسل رسوله بالهدى ودين الحق ليظهره على الدين كله ولو كره المشركون**" (توبہ:۳۳)(وہ اللہ ہی ہے جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور دین حق کے ساتھ بھیجا ہے تا کہ اسے پوری جنس دین پر غالب کردے خواہ مشرکوں کو یہ کتنا ہی ناگوار ہو)،"**هو الذي أرسل رسوله بالهدى ودين الحق ليظهره على الدين كله وكفى بالله شهيدا**" (فتح:۲۸)(وہ اللہ ہی ہے جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور دین حق کے ساتھ بھیجا ہے تا کہ اس کو پوری جنس دین پر غالب کردے اور اس حقیقت پر اللہ کی گواہی کافی ہے)اور"**هو الذي أرسل رسوله بالهدى ودين الحق ليظهره على الدين كله ولو كره المشركون**" (الصف:۹)(وہی تو ہے جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور دین حق کے ساتھ بھیجا ہے تا کہ اسے پورے کے پورے دین پر غالب کردے خواہ مشرکین کو یہ کتنا ہی ناگوار ہو)۔ یہ انداز اس لئے اختیار کیا گیا تا کہ کچھ لوگ یہ نہ خیال کرنے لگیں کہ اس سے مراد اسلام کا وہ موجودہ بشری دائرہ ہے جو اسلامی فتوحات اور اشاعت اسلام کی ابتدائی کارروائیوں کے نتیجہ میں ہونے والی اس کی اولین اشاعت اور جغرافیائی توسیع کے تحت آتا ہے اور اس سے یہ اشتباہ یا خیال نہ پیدا ہو کہ "اسلام کی متوقع عالم گیریت" پھر ان ہی روایتی جہتوں اور وسائل کو اختیار کرے گی جیسا کہ اہل کتاب کے انبیاء کی پیشن گوئیوں کی صورت حال

ہے کہ وہ لوگ غیبی طور پر اور بغیر کسی سبب کے معجزات اور مافوق العادت امور کی طرح ان کے واقع ہونے کا خیال رکھتے ہیں یا ان ہی اسباب کے ساتھ ان کے واقع ہونے کی رائے رکھتے ہیں جو ان انبیاء اور رسولوں کے زمانوں میں پائے گئے، حقیقت یہ نہیں ہے۔ تاریخی انقلاب اللہ تعالی کی ان سنتوں اور قوانین کا تابع فرمان ہے جن کی تخلیق وتحریک اور انضباط میں اللہ تعالی نے انتہائی مستحکم طریقہ اختیار کیا ہے تا کہ ان کے ذریعہ اللہ تعالی کے مقرر کردہ مقاصد کی تکمیل ہو۔

انسانیت علوم و معارف اور تعلیمی مناہج میں بہت ہی ترقی یافتہ معیار پر پہنچ چکی ہے۔ اپنی طویل عمر میں اس نے جزئی احیائی عقل سے آگے بڑھ کر عقل طبعی تک رسائی حاصل کر لی ہے، پھر وہ ان دونوں مراحل کو عبور کر کے ''عقل وضعی'' کی سرحدوں میں قدم رکھ چکی ہے اور اب اسے عقل علمی کے مرحلہ میں داخل ہونا ہے۔ موجودہ صورت حال یہ ہے کہ اس نے ''عقل علمی'' کے بعض نتائج کے سلسلے میں شکوک وشبہات کا اظہار کرنا شروع کر دیا ہے اور ان پر تنقید کرنے لگی ہے۔ اسی طرح انسانیت کو تنقید وتجزیہ کے ذریعہ اس کا احساس ہونے لگا ہے کہ ''عقل علمی'' نے اس کو انتشار سے دو چار کیا ہے اور اتحاد کی قوت عطا کرنے سے قاصر رہی ہے۔ انسانیت کو اس مرحلہ کی سنگینی کا ادراک ہونے لگا ہے جہاں وہ ''عقل علمی'' کی رہنمائی میں پہنچی ہے اور اسے یہ محسوس ہونے لگا ہے کہ اگر وہ اسی راستہ پر مسلسل چلتی رہی تو فنا اور لغویت کے گھاٹ اتر جائے گی اور کھائی میں جا گرے گی یا ''خاتمہ تاریخ''(End of the history) تک جا پہنچے گی۔ مغرب میں بطور خاص اہل علم کے حلقوں میں تناؤ اور بے چینی کی جو فضا چھائی ہوئی ہے، وہ بہت زیادہ سنگین ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اسلام اس مسئلہ کا ایک علمی حل پیش کرنے پر قادر ہے۔ ہمارا مطلب یہ ہے کہ مسلمان ایک ایسا علم پیش کر سکتے ہیں جو اپنے استناد اور منہج میں قرآن عظیم سے نسبت رکھتا ہو اور عالمی سطح پر ایک تہذیبی متبادل کی نمائندگی کرتا ہو۔ سوال یہ ہے کہ یہ عمل کیسے انجام پائے؟

## اسلامی سطح پر ''عالم گیریت'' کی راہ کی رکاوٹیں:

تاریخی صورت حال کی وجہ سے عوام الناس کے ذہنوں میں بعض غلط امور مسلمات کی حیثیت سے راسخ ہو چکے ہیں۔ان ہی میں سے ایک یہ ہے کہ آپ ﷺ نے دیگر حکومتوں کی طرح ایک مذہبی حکومت قائم کی اور یہ حکومت قومی یا علاقائی بھی ہوسکتی ہے، نیز یہ کہ مسلمانوں سے ان ہی ذرائع اور وسائل کے اختیار کرنے کا مطالبہ کیا گیا جو اشاعت اسلام کی اولین کارروائیوں میں اختیار کئے گئے تھے یعنی فتوحات۔ذہنوں میں یہ بات بیٹھ گئی ہے کہ امت مسلمہ پر فرض ہے کہ وہ اس دور میں بھی حکومت مدینہ ہی کی طرف سے انجام دی جانے والی ذمہ داریاں سنبھالے اور یہ حکومت ساری دنیا کو ایک مسلمان خلیفہ کی اطاعت میں لانے کا نقطہ آغاز ہو جس کی ذمہ داری ہوگی کہ وہ دارالحرب کے باشندوں کو دارالاسلام کا شہری بنائے اگر ایسا کرنا ممکن ہو ورنہ امام مہدی کے ظہور اور حضرت مسیح کے نزول تک انتظار کیا جاسکتا ہے(۱)، جن کے ذریعہ

---

۱- امام مہدی کی آمد اور حضرت مسیح کے دوبارہ دنیا میں آنے کے تصورات میں سے کسی ایک کا بھی ذکر قرآن میں نہیں ہے نہ ان کی کوئی دلیل اس میں مذکور ہے۔اس کے برخلاف ہمیں کثرت سے ایسی تاکیدات ملتی ہیں جو دین کی تکمیل اور اس کے اتمام کو صراحت اور قطعیت کے ساتھ بیان کرتی ہیں:''**اليوم أكملت لكم دينكم واتممت عليكم نعمتي ورضيت لكم الإسلام دينا**'' (مائدہ:۳)(آج میں نے تمہارے دین کو تمہارے لئے مکمل کردیا ہے اور اپنی نعمت تم پر غالب کردی ہے اور تمہارے لئے اسلام کو تمہارے دین کی حیثیت سے قبول کرلیا ہے)۔اسی طرح رسول اللہ ﷺ کے خاتم النبیین ہونے کی صراحت ملتی ہے: ''**ما كان محمد أبا أحد من رجالكم ولكن رسول الله و خاتم النبيين**'' (احزاب:۴۰)(محمد تمہارے مردوں میں سے کسی کے باپ نہیں ہیں مگر وہ اللہ کے رسول اور خاتم النبیین ہیں اور اللہ ہر چیز کا علم رکھنے والا ہے)۔ختم نبوت بدرجہ اولی ختم رسالت کا مقتضی ہے۔امام مہدی اور حضرت مسیح کی واپسی کے دونوں ہی تذکرے اخبار آحاد میں ہیں جن سے قطعیت کا فائدہ نہیں پہنچتا، بلکہ ان سے ظنیت ظاہر ہوتی ہے۔اسی لئے علماء عقائد نے ان دونوں تصورات کو ان یقینی امور کے دائرہ سے خارج رکھا ہے جن پر ایمان لانا واجب ہے اور جن کے منکر کو کفر کی طرف منسوب کیا جاسکتا ہے۔بعض کی رائے ہے کہ اس سلسلے میں مذکور احادیث اگرچہ اخبار آحاد ہیں مگر ان کا اعتبار کیا جائے گا اور ان سے عقائد ثابت نہیں ہوں گے البتہ ان سے ''معنوی تواتر'' کا فائدہ پہنچ سکتا ہے۔بہرحال یہ دونوں ہی چیزیں یعنی امام مہدی کی آمد اور حضرت مسیح کی واپسی اختلافی امور میں سے ہیں۔اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔

پوری دنیا کے اسلامیانے کا کام انجام دیا جائے گا!!اسی طرح یہ بات بھی ذہنوں میں جڑ پکڑ چکی ہے کہ مسلمانوں کواس خواب کی تعبیر یعنی بااختیار اور غالب حکومت کے قیام کے لئے دائمی اور مسلسل فضا تیار کرتے رہنے کی ضرورت ہے۔

یہ معاصر ''اسلامی پیغام'' اسی تمنا کا اسیر رہا۔اس کے گرد اس کو بروئے کار لانے سے متعلق مختلف اسباب وعوامل یا ذرائع ووسائل کا گھیرا قائم رہا۔مسلمان عقلیں اور نظریں اپنے خیال کے مطابق سب سے بڑی آرزو یعنی ''حکومت کے قیام اور اقتدار تک رسائی'' کی تکمیل کے وسائل کی جستجو میں ''معاصر صورت حال'' یا مستقبل کو نظر انداز کر کے محض تاریخی صورت حال سے چپک کر رہ گئیں۔اس کے نتیجہ میں مسلمان اسلام کے جن مقاصد کی تکمیل کی منزل سے دور ہو گئے، وہ یہ تھے:

''روئے زمین پر اسلام کی اشاعت، اس کو غالب کرنا اور ایک پاکیزہ اسلامی زندگی کے آغاز کے لئے اسلام کی طرف سے مہم چھیڑنا۔مغرب کے ساتھ تعلقات کی پیچیدگی نے صورت حال کو اور زیادہ خراب کر دیا خصوصا آل عثمان کی سلطنت کے خاتمہ اور ''سائیکس پیکو'' منصوبوں کے مطابق مسلمانوں کے مختلف حصے بخرے ہو جانے کے بعد۔اس انتشار کے نتیجہ میں ہر ملک نے اپنی تمام تر ایمانی توانائیوں اور دینی سرمایے کو کام میں لا کر حملہ آوروں اور سامراجیوں کا مقابلہ کیا اور اپنے ملک ووطن سے اپنے دشمنوں اور غلام بنانے والوں کو نکال باہر کیا۔اس سے عمومی طور پر روایتی صورت حال کو تقویت حاصل ہوئی۔اسی طرح اس کے نتیجہ میں ردو انکار کی وہ صورت حال بھی مستحکم ہوئی جس کی رو سے کش مکش کو ہوا دینے والے فریق کی طرف سے آنے والی ہر چیز کو اس کی نوعیت سے صرف نظر کرتے ہوئے رد کرنے کا رجحان عام تھا۔یہیں سے معاصر مسلم ذہن میں اسلام کی تاریخی صورت حال کے فکری حقائق ونتائج مستحکم ہو گئے اور مسلمان نسلیں بغیر کسی نقد ونظر کے ہمیشہ ان کی جگالی کرتی رہیں اور اس تاریخی صورت حال کے نتائج کو

ان کے اختلاف وتنوع کے باوجود موجودہ امت کے وجود وبقاء کے تحفظ کے لازمی ذرائع اور وسائل قرار دینے لگیں بنظر ثانی یا تنقید یا تحقیق کے بغیر اس کے تمام اجزاء سے خواہ وہ خیر ہوں یا شر، عمدہ ہوں یا ردی، طیب ہوں یا خبیث، وابستہ رہنے کو انہوں نے ترجیحی حیثیت دے ڈالی اور بجنسہ اس تہذیبی سرمایے کا دفاع کرنے والے افراد کو انہوں نے نمونہ، ہیرو اور حقیقی قائد قرار دے لیا۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ مغلوب غالب کی تقلید کا دل دادہ ہوتا ہے۔ اس کی حرکات وسکنات عموماً اس شخص کے اعمال کا ردعمل ہوتی ہیں جو اس پر مسلط اور حاوی ہوتا ہے۔

یہ مغلوبیت اس وقت دو آتشہ ہوجاتی ہے جب مغلوب فرد انتہائی سخت پیچیدہ فکری بحران اور عقلی جمود سے دوچار ہو۔ اس صورت حال نے دور جدید میں قرآنی تہذیبی متبادل کی پیش کش کے عمل کو حد درجہ پیچیدہ اور مشکل بنا دیا ہے۔ اس مقام پر پہنچ کر ہم یہ سمجھتے ہیں کہ کیوں اللہ تعالی نے اپنے رسول ﷺ کو یہ حکم دیا کہ وہ لوگوں سے قرآن، اس کی تعلیمات اور اس کے احکام کے ذریعہ بڑا جہاد کریں: "وجاهدهم به جهادا كبيرا" (فرقان: ۵۲) (اس قرآن کو لے کر ان کے ساتھ جہاد کبیر کرو) یعنی لوگوں کے سامنے قرآن کی تلاوت کرکے، ان سے اس کی تلاوت، اس پر تدبر اور اس کے مسائل کا شعور حاصل کرنے کا مطالبہ کرکے، ان کو اس کی تعلیم دے کر، اس کے ذریعہ ان کا تزکیہ کرکے، ان کے دلوں میں اس کو پیوست کرکے، ان کو اس کی مقرر کردہ حدود کے اندر ٹھہرے رہنے کی دعوت دے کر، ان سے تجاوز اور ان کی خلاف ورزی سے باز رکھ کر آپ ان سے جہاد کریں۔

## مغرب کی سطح پر "عالم گیریت" کی راہ کی رکاوٹیں:

موجودہ مغربی عالم گیریت یا مرکزیت کی مختلف فکری خصوصیات میں سے ایک یہ ہے کہ یہ ایک ایسی وضعی عالم گیریت ہے جس نے منہجیت کو بطور ہتھیار اختیار کیا، اس نے انسان کے

اندر کی تنقیدی اور تجزیاتی صلاحیتوں کو ابھارا ہے اور ہر اس چیز سے نفرت کے رجحان کو پروان چڑھایا ہے جو اس کے خالص لبرل انتخاب کی آزادی پر اثر انداز ہوتی ہے۔ یہ نیم عالم گیر مرکزیت متحرک ہی اس لئے ہوئی ہے تا کہ تمام لوگوں پر اپنی ذات، اپنی قدریں اور اپنی خصوصیات تھوپے اور مسلمان اور اسلامی ممالک سمیت پورے کرۂ ارض کو اپنے دائرہ اثر و رسوخ میں لے لے۔اس عالم گیریت نے اس اندیشہ سے کہ کہیں وہ دوبارہ پھر نہ کلیسائی مذہبی لاہوتی چنگل میں پھنس جائے، مذہبی نوعیت کی ہر چیز سے متعلق احتیاط اور شک کے تصور کو تقویت پہنچائی ہے۔اب ایسی صورت حال میں اسلام کو ایک تہذیبی متبادل کی اساس کے طور پر کیسے پیش کیا جاسکتا ہے؟ اور انسانیت یہ کس طرح تسلیم کرسکتی ہے کہ محفوظ و مفصل قرآن مجید کے اندر حل موجود ہے؟ جبکہ قرآن تو اس کی نظر میں محض ایک مذہبی کتاب ہے؟

یہی وہ معاصر چیلنج ہے جو ہمارے دور کے حاملین قرآن کو درپیش ہے۔

اسلام کو اگر اسی صورت میں پیش کیا جاتا رہا جس میں آج کے مسلمان اس کو پیش کر رہے ہیں، جن میں اسلامی تحریکات اور وہ تنظیمیں بھی شامل ہیں جنہوں نے اسلامی اقدار کو حلال و حرام کے دائرہ اور روایتی فقہ اور عہد تدوین کے علوم کے فریم میں پیش کیا ہے، تو اس میں کوئی شک نہیں کہ دنیا کی طرف سے اس کے حصہ میں تسلسل کے ساتھ رد و انکار، حملہ اور جارحیت کے سوا کچھ نہ آئے گا، اگر اسلام کو اس جغرافیائی خطہ کے ایک ہمہ گیر رمز کے طور پر پیش کیا جائے گا جہاں مسلمان اس وقت رہ رہے ہیں، اسی طرح اگر اسلام کو ان بشری عناصر کے مظہر کے طور پر پیش کیا جائے گا جو اسلام کی طرف منسوب اور اس کی نمائندگی کے دعویدار ہیں، جیسا کہ اس سے پہلے اسلام کی طرف منسوب تاریخی صورت حال کی نمائندگی، نیز اسلام کے تہذیبی سرمایے کی تدوین اور اس کے بعد کے عہد کے مسلمانوں کی تہذیبی میراث کے نتائج تحقیق کی نمائندگی کے حوالہ سے ایسا کیا جاچکا ہے، تو اسے اس زاویہ سے دیکھا جائے گا کہ یہ یہودیت اور عیسائیت کی ایک بگڑی

ہوئی شکل ہے۔یہودیت اور عیسائیت کے متبعین اپنے اپنے مذاہب کو ان کے منفی پہلوؤں سے بچانے میں کامیاب ہو چکے ہیں۔اسی طرح انہوں نے ان منفی امور کا دائرہ انتہائی تنگ کر کے ان مذاہب کو محض روٹینی مذاہب میں تبدیل کر دیا ہے جن کا کام انسان کی ضرورت کے مطابق خدمات پیش کر کے اس کے روحانی شوق و ذوق کی تکمیل کرنا ہے۔اسی طرح کبھی کبھار اس کے نفسیاتی امراض کا مداوا کرنا بھی ان کی ڈیوٹی میں شامل ہے۔یہ مذاہب انسان کی اپنی طے کردہ ضروریات اور تقاضوں کے مطابق تغیر و تبدل کے مراحل سے گذرتے رہتے ہیں۔اس میں کوئی شک نہیں کہ آج اسلام کو اہل اسلام اور غیر اہل اسلام دونوں کے سامنے اس صورت میں پیش کیا جا رہا ہے جو اسلام کی عظمت اور اس کی شان کے مناسب نہیں ہے۔یعنی یہ کہ اسلام کو روایتی فقہ اور اس کے ماہرین کے حوالہ سے پیش کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے جب کہ یہ روایتی فقہی سرمایہ ہماری تاریخ کے جلیل القدر فقہاء کی محض ان کاوشوں کی نمائندگی کرتا ہے جو ان کے اپنے خاص معاشرہ کے مسائل کے حل سے متعلق ہیں۔ان معاشروں میں حصول معاش کے لئے یا تو سادہ طریقہ پر زراعت ہوتی تھی یا جانوروں کے چرانے کا طریقہ رائج تھا یا ان معاشروں میں منافع کے سادہ تبادلہ پر مبنی انفرادی تجارت کا رجحان تھا۔اب اگر اس روایتی سرمایہ اور فقہی ذخیرہ سے یہ مطالبہ کیا جائے کہ وہ موجودہ معاشروں اور ان کی اقتصادیات سے متعلق اس طرح کے پیچیدہ مسائل کا حل پیش کرے تو یہ ایک طرف تو اس سرمایہ پر اس کی طاقت سے زیادہ بوجھ ڈالنا ہے، دوسری طرف ہم ان کے ذہنوں میں ایسے من گھڑت مسائل کا حل ڈال رہے ہیں اور ان کی زبانوں پر اسے جاری کر رہے ہیں جن سے وہ واقف ہی نہیں تھے، نہ انہوں نے ان پر غور کیا نہ ان کے سلسلے میں انہوں نے اجتہاد کیا۔یہ تو وہ مسائل اور تعلقات ہیں جو ان کے زمانہ میں پیش ہی نہیں آئے۔آخر وہ ان مسائل کا حل کہاں سے پیش کر سکتے ہیں جو ان کے ذہن میں آئے ہی نہیں؟ ایسی رائے اسلام اور اس کی عالم گیریت پر منفی اثرات مرتب کرنے والی ہے۔اس سے نہ

صرف اس کی عالم گیریت کی نفی ہوتی ہے بلکہ اس سے اسلام کا جونقشہ ابھر کر سامنے آتا ہے، وہ یہ کہ اسلام ایک ایسا دین ہے جو یا تو صرف دیہاتی اور ان سیدھے سادے معاشروں کے مناسب حال ہے جن میں جانوروں کے چرانے کا رواج ہو یا یہ صرف جنگلی سماجوں کے لئے موزوں ہے۔ کیونکہ اسلام تو نوع انسانی کے سامنے اپنے ظہور کی ابتداء ہی سے ایک عالم گیر دین ہے جب خاتم النبیین ﷺ پر "اقرأ" (پڑھئے) کا نزول ہوا تھا اور ایک ایسا عالم گیر اسلامی دعوتی معاشرہ وجود میں آیا تھا جو دنیا کے بیچوں بیچ مشرق میں بحرالکاہل تک اور مغرب میں بحر اٹلانٹک تک پھیلا ہوا تھا اور اس نے تینوں براعظموں "ایشیا، افریقہ اور یوروپ" کو ایک دوسرے سے مربوط کر دیا تھا۔ اس پہلی اسلامی عالم گیریت نے مختلف تہذیبوں، ثقافتوں اور نسلوں کو ایک متحد انسانی فریم میں ضم کر کے "مشرق و مغرب" کی دوئی کو ختم کر دیا۔ اسلام کی روشنی یورپ تک اسی طرح پہنچی جس طرح اس سے پہلے ایشیا اور افریقہ تک پہنچی تھی۔ اس طرح اسلام تمام سابقہ نبوتوں کے لئے ایک قابل قبول نقطۂ اختتام اور تمام رسالتوں پر حاوی ایک آخری پیغام قرار پایا۔ اسلام کے پیغام نے اپنے ربانی جوہر کے ذریعہ پورے عالم کو اپنے اندر سمولیا۔ اس کا نقطۂ آغاز اگرچہ ایک دینی پیغام تھا مگر اس کا دروازہ سب کے لئے کھلا تھا: "**لا إكراه في الدين قد تبين الرشد من الغي**" (بقرہ:۲۵۶) (دین کے معاملے میں کوئی زور زبردستی نہیں ہے، صحیح بات غلط خیالات سے الگ چھانٹ کر رکھ دی گئی ہے)۔

اسلام کی یہی وہ عالم گیریت ہے جو زمانہ ماضی کی طرح آج بھی انسانیت کو متحد کرنے والی اور اس کے درمیان سے ہر قسم کے امتیازات کا کلی صفایا کر دینے والی ایک نامیاتی ہم آہنگی کی قوت کی نمائندگی کرتی ہے بشرطیکہ اس کو اس کے تناظر میں سمجھنے کی کوشش کی جائے۔

## عالم گیریت اور مسائل:

عالم گیریت کی ضرورت انسانی اور وضعی فریم میں اس وقت زیادہ پیش آتی ہے جب

مختلف قومی، علاقائی اور مرکزی مسائل سنگین نوعیت اختیار کر لیتے ہیں اور علاقائی تہذیبی نظام انحطاط اور معدومیت سے دوچار ہونے لگتے ہیں۔ جہاں تک اسلامی عالم گیریت کا تعلق ہے تو اس کی طرف رہنمائی دوسری چیزوں کے ساتھ ساتھ اللہ تعالی کی ایک محکم تقدیر کے ذریعہ بھی ہوتی ہے۔ اللہ تعالی نے امیوں کی آزادی سے اپنے پیغام کا آغاز کر کے اس کو مستحکم فرمایا۔ اس طرح اس نے خوش خبری دینے والی آیات واحادیث کے ذریعہ اس کے اختتام کو محکم فرمایا، یعنی سورۂ توبہ، سورۂ فتح، سورۂ صف کی وہ آیات اور ان کی تفسیر میں وارد وہ صحیح احادیث جن میں حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر حضرت محمد ﷺ تک کے تمام انبیاء کے ذریعہ لائے گئے اسلام کے دیگر تمام ادیان پر غلبہ کی بشارت دی گئی ہے اور یہ کہا گیا ہے کہ اسلام تمام ادیان کو اپنے اندر سمو لے گا۔ اسلام نے حضرت آدم علیہ السلام کے جنت سے نکلنے سے لے کر حضرت ابراہیم علیہ السلام تک کے پھیلے ہوئے عرصہ میں اپنے اصولوں پر نظر ثانی اور ان کی تہذیب کی ہے، پھر حضرت محمد ﷺ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام سے لے کر اپنے زمانہ تک کے طویل مرحلہ میں اس پر جامع اور آخری نظر ڈالی ہے۔ اس طرح یہ دین مکمل ہوا ہے اور اپنے متبع پر کھڑا ہوا ہے جیسا کہ اللہ تعالی کا ارشاد ہے: **"اليوم أكملت لكم دينكم واتممت عليكم نعمتي ورضيت لكم الإسلام دينا"** (مائدہ: ۳) (آج میں نے تمہارے دین کو تمہارے لئے مکمل کر دیا ہے اور اپنی نعمت تم پر تمام کر دی ہے اور تمہارے لئے اسلام کو تمہارے دین کی حیثیت سے قبول کر لیا ہے)۔

اسی طرح سابقہ تمام ایشیائی اور افریقی تہذیبوں میں سے کسی تہذیب نے بھی کوئی ایسی ''عالم گیر جہت'' تشکیل نہیں دی جو اپنی عالم گیریت کے لحاظ سے اسلام کی عالم گیریت کے بالمقابل ہو۔ صرف یوروپی مغرب نے دو ایسی ''عالم گیریتیں'' تشکیل دیں جو تاریخی حیثیت سے اسلام کی پہلی عالم گیریت کے بالمقابل تھیں۔ یہی یوروپی مغرب اس وقت بھی متوقع اسلامی عالم گیریت کو چیلنج کر رہا ہے اور مندرجہ ذیل تاریخی طریقوں سے اس کی راہ روکنے کی کوشش کر رہا ہے:

۱-موجودہ مغرب اپنے کو اس ہیلینی (Hellenistic) عالم گیریت کا جانشیں تصور کرتا ہے جو مشرق کی تمام روایتی علاقائی تہذیبوں نیز پورے بحر روم کو محیط تھی، اسکندر مقدونی (۳۲۴-۳۵۶ق م) کے حملوں کے وقت سے یہ وسعت، پھیلاؤ اور ہمہ گیری کے لحاظ سے اولین نوعیت کی عالم گیریت تھی۔

۲-ہیلینی رومی عالم گیریت کے بعد اس کی جگہ لینے والی عالم گیریت کی صورت حال بھی یہی رہی جب ۲۰۱ق م میں اس کا دائرہ اثر بحر روم تک وسیع ہوگیا اور اس کے بعد ''شرق اوسط'' نامی علاقہ پر اس کا کنٹرول ہوگیا(۱)۔

ہیلینی اور رومی تہذیبیں وضعی نہج کی حامل تہذیبیں ہیں، کیونکہ ان کا مذہبی سرمایہ آسمانی نہیں ہے۔ ایتھنز کے تعلق سے ان کے عناصر ترکیبی یا تو اولمپیا کے دیوتاؤں کی قوت سے ماخوذ ہیں یا ان قیاصرہ (Caesars) کی قوت سے جن کو ''روم'' میں دیوتاؤں کا درجہ دیا جاتا تھا۔ یہ اس زمانہ کی بات ہے جب روم نے اس مسیحی لاہوت کو قبول نہیں کیا تھا جو اس کے پاس محرف حالت میں مجسم معبود کی شکل میں پہنچا تھا یعنی وہاں اسے ایک ایسے معبود کی حیثیت حاصل نہیں ہوئی تھی جو اپنی الوہیت کے دعوے دار اولمپیا کے معبودوں اور قیاصرہ (Caesars) کی تفصیلات سے اپنی خصوصیات اخذ کرتا ہو۔

اسی طرح عیسائیت مغربی یورپ کے ہاتھوں ہیلینی اور رومی روایات سے بوجھل مظاہر اور رسوم میں تبدیل ہوگئی اور اس کا اس توحیدی بنیاد سے کوئی تعلق باقی نہیں رہا جسے حضرت موسی اور حضرت عیسی علیہما السلام اس مقدس سرزمین میں لے کر آئے تھے جس میں اللہ تعالی نے برکت

---

۱- ''شرق اوسط'' کے مصداق سے متعلق متعدد آراء ہیں۔ آراء کا یہ اختلاف تاریخی نقطہ نظر کے اختلاف کے نتیجہ میں واقع ہوا ہے۔ اس اصطلاح کی تعریفات سے متعلق تفصیل کے لئے دیکھئے: ''الشرق الاوسط الجدید'' علاء عبدالوہاب، قاہرہ: سینا للنشر، ۱۹۹۵ء، ص ۵۱-۶۷، اسی طرح وہ تعلیمی نوٹ جو ڈاکٹر منی ابو الفضل نے قاہرہ یونیورسٹی کے اپنے ان طلبہ کے لئے تیار کیا تھا جنہیں وہ ''النظم العربیۃ'' کا موضوع پڑھاتی تھیں۔

عطافرمائی تھی۔

ہیلینی اور رومی تہذیبیں ایک ایسے تہذیبی نظام میں تشکیل پذیر ہوئیں جس کے انسان سے متعلق اپنے مخصوص نظریات تھے۔ان نظریات کی رو سے یہ درست تھا کہ ایک انسان کو خالص غلام یا تابع مہمل بنانے کے بجائے محنت کی توانائی تصور کر کے اس سے بیگار لی جائے اور اسے ایتھنز اور روم کے نظریہ کے مطابق تسخیر شدہ طاقت اور قوت میں تبدیل کر دیا جائے۔ان دونوں تہذیبوں کی نظر میں سب سے بہتر غلام وہ پہلوان ہوتا تھا جو میدان جنگ میں اپنے آقاؤں کے سامنے اپنے مدمقابل کو پچھاڑ دیتا اور فخر کے ساتھ گرتے ہوئے جسم کے بل کھڑا ہو جاتا اور پھر مڑ کر اپنے ان ہی آقاؤں کے آگے جھک جاتا۔مغرب کے موجودہ باشندے اپنے کو ان ہی دونوں تہذیبوں کا وارث سمجھتے ہیں۔انسان کے متعلق ان کے نظریات اپنے اسلاف کے نظریات سے کچھ زیادہ مختلف نہیں ہیں۔یہی لوگ تو ہیں جنہوں نے انسانوں سے کانوں میں اور مختلف صنعت وحرفت میں بیگار لی،انہیں تجربہ کے لئے،مہارت کو فروغ دینے کے لئے اور تھوک کے حساب سے معلومات حاصل کرنے کے لئے آدھا یا پورا،زندہ یا مردہ،تجربہ گاہوں میں دھکیلا،وسیع پیمانہ پر تخریب وتباہی کے ایسے ایسے ذرائع اور وسائل ایجاد کئے جن سے پوری روئے زمین پر آباد انسانوں کی زندگی کا خاتمہ کیا جاسکتا ہے۔ان کے اسلاف بھی فلک بوس عمارتوں، محلوں اور قلعوں کی تعمیر میں انسانوں سے بیگار لیتے تھے۔یہ تہذیبی نظام اپنے دونوں دھڑوں یعنی وارث اور مورث سمیت انسان کے متعلق ایک ایسے نظریہ پر مبنی ہے جو لازماً کش مکش، رسہ کشی اور اختلاف وانتشار پر منتج ہوگا،خواہ وہ ایسے نعروں کا سہارا ہی کیوں نہ لے جو بظاہر مغرب کی تہذیبی پیش رفت پر حکمرانی کرنے والی اقدار کے منافی نظر آئیں۔

دوسری طرف اس کے بالمقابل "اسلام کی اولین نوعیت کی عالم گیریت" ہے جو یونانی، رومی اور موجودہ مغربی تینوں وضعی عالم گیریتوں پر مندرجہ ذیل طریقہ پر خط نسخ پھیر دیتی ہے:

اول: ظالمانہ ہیلینی اور رومی عالم گیریت کے برعکس اسلام کی آمد کا مقصد ہی اقوام کو آزادی سے ہم کنار کرنا تھا، کیونکہ تاریخ نے بشمول وضعی تاریخ کے کوئی ایک واقعہ بھی ایسا ریکارڈ نہیں کیا ہے جس میں مسلمانوں نے اپنے مفتوحہ علاقوں کی اقوام کا قتل کیا ہو۔ جنگ کا رخ پوری طرح رومی لشکر، ایرانی سرکش افواج اور ان باغیوں اور طاقتوں کے خلاف ہوتا تھا جو ان کی حمایت کرتے تھے نہ کہ اقوام کے خلاف۔ ان اقوام نے تو اپنے آقاؤں کے خلاف مسلمان فاتح کی حمایت کی، چنانچہ تاریخ کا پہلا فاتح وہی ہے جو لوگوں کے پاس ان کو فتح کرنے کے لئے نہیں بلکہ انہیں آزاد کرانے کے لئے اور انہیں ایک ایسے آسمانی کتاب سے جوڑنے کے لئے آتا ہے جو انسان کو بہت ساری اخلاقی حدود و قیود کا پابند رکھتی ہے۔ اس طریقہ سے اسلام نے جبر و استبداد اور ظلم پر مبنی عالم گیریت کے مقابلہ میں سب سے پہلی عالم گیریت کی بنیاد ڈالی۔

دوم: اسلامی تہذیب اپنے متنوع عربی مراکز مدینہ منورہ، دمشق، بغداد، قاہرہ وغیرہ میں عقیدہ توحید کی بنیاد پر ممتاز ہوئی۔ اس تہذیب کو اپنے مخصوص معبود پر دیگر اقوام کے معبودوں کے مقابلہ میں غرور نہیں تھا۔ اس کا معبود خاص نہیں تھا، کیونکہ وہ سب کا معبود تھا۔ اسلامی تہذیب نے اپنا سفر شرک سے جنگ، توحید کی اشاعت اور دیگر توحیدی نبوتوں کے تہذیبی سرمایے میں در آنے والے انحرافات کے باوجود ان سے تعلقات کی استواری سے شروع کیا، لہذا یہودیت اور نصرانیت اور ان کے قبیلے برقرار رہے، نیز اسلام کے ہمہ گیر ڈھانچہ میں بقائے باہم کے اصولوں پر رہ رہے مذاہب میں مجوسیت اور صابئیت کا اضافہ ہوا۔ یہ تمام کے تمام مذاہب اسلام کے فراہم کردہ تحفظ، سلامتی اور اس کے عطا کردہ انصاف سے مستفید ہوئے۔ اس طرح اسلامی وجود ہی وہ پہلا ڈھانچہ ہے جس میں ابراہیمی اور غیر ابراہیمی تمام ہی مذاہب کے ماننے والے آپسی میل و محبت کے ساتھ رہے اور کسی نے کسی کو اپنا مذہب بدلنے پر مجبور نہیں کیا: "**لا إكراه في الدين قد تبيين الرشد من الغي**" (بقرہ:۲۵۶) (دین کے معاملے میں کوئی زور زبردستی نہیں

ہے۔صحیح بات غلط خیالات سے الگ چھانٹ کر رکھ دی گئی ہے)۔اور اگر تبدیلی مذہب پر جبر کی صورت اختیار کی جاتی تو آج مسلم ملکوں میں کوئی اقلیت موجود نہ ہوتی۔

سوم: اسلام کا تہذیبی نظام اس لحاظ سے ممتاز ہے کہ اس نے مفتوح علاقوں کی اقوام کو غلام نہیں بنایا۔اسلام کے سب سے پہلے دارالسلطنت مدینہ منورہ کی تعمیر نو آبادیات سے غلام بنا کر لائے گئے لوگوں کے ہاتھوں نہیں ہوئی، نہ وہاں عمارتوں کی تعمیر میں لوگوں سے بیگار لی گئی، دمشق، بغداد یا قاہرہ بھی اس طریقہ سے تعمیر نہیں کئے گئے۔جہاں تک زکاۃ کا تعلق ہے تو وہ انہی علاقوں میں تقسیم کردی جاتی تھی جہاں سے وہ وصول کی جاتی تھی، غیر مسلموں میں موکفتہ القلوب کو بھی زکاۃ میں سے حصہ ملتا تھا، اسی طرح محنت اور کمائی سے قاصر رہ جانے والوں یا ان لوگوں کو بھی زکاۃ کی رقم میں سے حصہ ملتا تھا جن کی آمدنیاں ان کے اخراجات کے لئے ناکافی ہوتی تھیں۔ جزیہ ان ہی لوگوں کے دفاع پر خرچ ہوتا تھا جو اسے ادا کرتے تھے۔اس کے برعکس ایتھنز اور روم کے محلات اور قلعوں کی تعمیر بیگار لئے گئے غلاموں کے ذریعہ ہوئی۔الغرض اسلام کا تہذیبی نظام اپنی انسانیت دوستی کے لحاظ سے ہیلینی اور رومی نظام کی ضد ہے۔

یہ عالم گیریتیں اسلام اور اس توحید کے بالمقابل ہیں جو تمام انبیائی تہذیبی سرمایوں کی بازیابی اور ان کو ان کے تمام الحاقات سے پاک وصاف کرنے پر مبنی ہے۔اگر اس انبیائی تہذیبی سرمایہ کو اسلام کی عالم گیریت سے مربوط کردیا جائے تو یہ سابقہ یوروپی عالم گیریت کی جگہ لے سکتا ہے جو اپنے عالم گیریت پر مبنی نظریات میں یوروپی عالم گیریت سے مختلف ہوگا؛ کیونکہ یہ ملحدانہ یا مشرکانہ وضعی نظام کے بالمقابل توحید کو پیش کرے گا۔اسی طرح ظلم وجبر پر مبنی نظام کے مقابلہ میں ربانی اقدار کے مجموعہ پر مبنی اسلام کے تہذیبی نظام کو متعارف کرائے گا۔یہ انبیائی تہذیبی سرمایہ بندگان خدا کو کسی حکمراں یا سلطان کا تابع فرمان بنانے کی بجائے ان کو ان کے خالق سے جوڑے گا۔

اسی طرح رومی ہیلینی تہذیب کی صورت میں جلوہ گر وضعی نظام پر مبنی عالم گیریت کی حیثیت اسلام کی اس اولین اور منفرد عالم گیریت کی آمد سے ختم ہوجاتی ہے جو اپنے افکار، اساسیات، سیاسی بنیادوں اور نتائج کے لحاظ سے اس سے بالکل مختلف ہے۔ فن تاریخ، ٹکسٹ اور تہذیب کے ماہرین اسلام کے زیر سایہ افکار ونظریات کی اشاعت اور ان کے فروغ پانے کے سلسلے میں تحقیق کرسکتے ہیں۔ وہ اس موضوع پر غور وفکر کرکے مذکورہ تمام پہلوؤں پر تفصیل کے ساتھ بھرپور اور مکمل نتائج تحقیق منظر عام پر لاسکتے ہیں۔ ہر محقق اس موضوع پر اپنے زاویہ نظر سے اور اپنے خصوصی میدان کے دائرہ میں بحث وتحقیق کرسکتا ہے۔

موجودہ دور کی مرکزی یوروپی تہذیب نے خواہ اس کی مشرقی شاخ ہو یا مغربی، اپنی تیسری عالم گیریت کی بنیادیں اس وقت مستحکم کرنا شروع کیں جب ہماری پہلی عالم گیریت کا زوال شروع ہوا۔ اس زوال وانحطاط کا سبب وہ جنگیں تھیں جن کو ہم نے نہیں بلکہ خود ان کی آگ بھڑکانے والوں نے ''صلیبی جنگوں'' کا نام دیا۔ ہم نے تو ان کو ''فرنگیوں کی جنگ''(۱) قرار دیا تھا۔ اس کے بعد اسی سقوط کے نتیجہ میں ۶۵۶ھ میں تاتاریوں کے ہاتھوں بغداد کا اور ۱۴۹۲ء میں اندلس کا سقوط ہوا۔ ہمارا پورا تاریخی سرمایہ ہمارے اس دعوے پر گواہ ہے۔ ہمارے اسلام نے نہ ہمیں صلیب وہلال کی جنگ چھیڑنے کا عادی بنایا نہ مشرق ومغرب کے درمیان کشمکش برپا کرنے کا فن سکھایا۔ اسلام کا مزاج اس سے ابا کرتا اور اس رجحان کو مسترد کرتا ہے۔ اس کے بعد جب انگریزوں نے اپنی ''تیسری یوروپی عالم گیریت'' کو مضبوط ومستحکم کرلیا تو انیسویں صدی کے اواخر سے ہمارے ملکوں پر حملے شروع کردیئے پھر انیسویں صدی کے نصف میں عالم اسلام کے

---

۱- آپ تاریخ کی ان کتابوں کا مطالعہ کریں جو ان مصنفین کی لکھی ہوئی ہیں جنھوں نے اس پورے دور کو یا اس کے ایک حصہ کو بچشم خود دیکھا ہے یا ان لوگوں کے دستاویزی مجموعے دیکھیں جنھوں نے اپنے سابقین کی تحریروں کا احاطہ کیا ہے اور ان پر اضافہ کیا ہے جیسے ''البدایہ والنہایہ'' کے مصنف ابن کثیر''، الکامل فی التاریخ کے مصنف ابن الاثیر، ''المقدمہ'' کے مصنف ابن خلدون اور ''تاریخ الدولتین'' کے مصنف ابی شامہ۔

بیچوں بیچ وطن عربی کے قلب میں زبردستی اسرائیل کا بیج بویا۔

اسی طرح انہوں نے مغرب میں بحر اٹلانٹک اور مشرق میں بحر الکاہل کے درمیان کے تمام مسلم ممالک پر اپنی بالادستی اور عالم گیریت یا اپنی نئی مرکزیت مسلط کردی اور اس کے آگے بھی پھیلتے ہی رہے یہاں تک کہ پوری دنیا کو اپنے زیر نگیں کرلیا۔اس طرح رومی جڑیں رکھنے والی یورپ کی مغربی تہذیب ہیلینی تہذیب کے بعد دنیا کی ''جدید عالم گیریت'' کی صورت میں ظاہر ہوئی۔یہ جدید عالم گیریت اپنی حیاتیاتی اور اعتقادی تفصیلات میں تقریباً پوری دنیا کا احاطہ کرتی ہے اور ہر چیز میں دنیا پر اپنے معیارات تھوپتی ہے۔یہ ایک ایسی دنیا چاہتی ہے جو ہر چیز میں اس کے تجویز کردہ نمونہ کے مطابق ہو۔چنانچہ آج ہمارے سامنے ایک نئے ''عالمی نظام'' کی صورت میں اس کا ایک نمونہ موجود ہے جو ہر چیز کو ''گلوبلائز'' یعنی امریکی مغربی مرکزیت یا یوروپی امریکی مرکزیت کے تابع کرنا چاہتا ہے۔یہ امریکی مغربی مرکزیت یا یوروپی امریکی مرکزیت کا نام بھی خود ان ہی کا تجویز کردہ ہے جس سے ان کے ایک جابرانہ اور ہمہ گیر مرکزی نظریہ کا اظہار ہوتا ہے۔

ہم ایک بار پھر ہیلینی اور رومی تہذیبوں کے مذکورالصدر تین تقابلی عناصر کا ذکر کریں گے، یہ ایک واقعہ ہے کہ ان عناصر سہ گانہ پر مبنی منظرنامہ ایک بار پھر نئے سرے سے ایک ''ہمہ گیر'' عالم گیریت کے ذیل میں ہمارے سامنے آرہا ہے۔سابقہ صورت حال کی طرح اس کی بھی حقیقت یہی ہے کہ:

۱-یہ ایک ایسی مرکزیت ہے جو ہمہ گیر اور عالم گیر بن چکی ہے۔اب وہ صرف یوروپی یا امریکی نہیں رہی۔یہ مرکزیت اقدار پر مبنی عالم گیریت کی کسی بھی خصوصیت سے عاری ہے۔

۲-یہ ایک ایسی وضعی مرکزیت ہے جس نے دینی اقدار کو اپنی عالم گیریت کی تہذیبی وجوہ جواز میں شامل نہیں کیا یہاں تک کہ اس نے مسیحی الٰہیات کی مخصوص دینی اور اخلاقی قدروں کو بھی بالائے طاق رکھ دیا اور ان کی جگہ ایک ایسا عجیب وغریب اور خودساختہ ملغوبہ شامل کردیا جو

تبدیل شدہ ''سیکرلرازم''تحریف شدہ ''عیسائی یہودیت''اور مخلوط بت پرستانہ روایات کا مجموعہ تھا۔امریکہ اس عجیب وغریب ملغوبہ کواوراس کے ساتھ عہد جدیدیت اور مابعد جدیدیت کے تمام عناصر نیز عقلی، علمی، صنعتی اور تکنیکی انقلابات سے پیدا شدہ نتائج کو آج پوری دنیا کے سامنے ایک نئے عالمی دین کی حیثیت سے پیش کررہا ہے اوراس کی کوشش ہے کہ تمام اقوام عالم اس کواختیار کرلیں۔اس کے مطابق اپنی تہذیب وثقافت کوتبدیل کرلیں۔اس کواختیار کرنے کے لئے یا اپنی اقوام کواس کے اختیار کرنے پر آمادہ کرنے کے لئے اوراس کے راستہ کی تمام رکاوٹوں کو دور کرنے کے لئے اپنے مذاہب، اپنے تشکیلی اور ترکیبی عناصر نیز اپنے تشخصات کوبدل ڈالیں۔

۳-یہ ایک ایسا تہذیبی نظام ہے جو جابرانہ قوت کا استعمال کرکے کش مکش اور تسلط کا سہارالیتا ہے۔ہمیں اس کے مقابلہ میں محض اپنے کو بچانے کے لئے نہیں بلکہ یورپ وامریکہ اور ساری دنیا کے تحفظ کے لئے اور دنیا کوایک ایسے بڑے گھر میں تبدیل کرنے کے لئے کیا کرنا چاہئے جہاں انسان امن وسلامتی کی نعمتوں سے مستفید ہوتے ہوئے اور ہدایت وحق کے راستہ پر چلتے ہوئے سکون واطمینان کے ساتھ رہ سکے؟

**پورے طور پر اسلام میں داخل ہونے کا اصول:**

ہم مغرب یا اس کے علاوہ کسی اور کے خلاف تعصب کے سیاق میں گفتگو نہیں کررہے ہیں، نہ ہمارا یہ مقصد ہے کہ حقیقی یا خیالی طور پر دوسروں کے مقابلہ میں اپنے کو بالاتر بنا کر پیش کریں۔کیونکہ روئے زمین کی خلافت اور شہادت علی الناس کا منصب ہمیں اللہ کی کسی بھی مخلوق کے خلاف تعصب یا روئے زمین میں تکبر کی اجازت نہیں دیتا۔اسی طرح ہم لوگوں پر اپنا اقتدار برقرار رکھنے کے لئے انسانوں کے درمیان تہذیبی کش مکش اور اختلافات کو گہرا کرنے کے بھی خلاف ہیں۔کیونکہ ہماری اسلامی عالم گیریت، زمانہ قدیم سے ہماری امت کا تمام لوگوں کے پاس آخری پیغام لے کر جانا، ہماری طرف سے مختلف تہذیبوں، ثقافتوں اورنسلوں کواپنے اندر

سمونے کی کوشش، تمام نبوتوں کی وارث نبوت کی تکمیل، تمام رسالتوں کا وارث دین اسلام، رسول اللہ ﷺ کی ہدایت پر ہمارا باہم برسر پیکار تہذیبوں کے دوہرے پن کو مسترد کر دینا، عقیدہ توحید سے ہماری وابستگی، لوگوں کا ایک دوسرے کو جاننے کی کوشش کرنا، احکام الٰہی پر ہمارا ایمان، یہ تمام امور ہم پر لازم کرتے ہیں کہ ہم ''پوری طرح اسلام'' میں داخل ہو جائیں۔ یہ تمام چیزیں ہمیں اس بات کی اجازت نہیں دیتیں کہ ہم دوسروں کے خلاف تعصب یا تنگ نظری یا تکبر کی دلدل میں پھنسیں، بلکہ ہم تو دوسروں کو اپنے خلاف تعصب برتنے پر معذور قرار دیتے ہیں، کیونکہ دوسرے کو اس کی تاریخی روایات، اس کا تہذیبی نظام اور اس کی دینی الٰہیات اس پر آمادہ کرتی ہیں۔ جہاں تک ہمارا تعلق ہے تو ہم کبھی بھی متعصب نہیں تھے اور نہ ہمیں زیب دیتا تھا کہ ہم متعصب یا غرور پسند ہوں۔ ہم تو لوگوں پر گواہ ہیں۔ لوگوں کے درمیان ہماری موجودگی اور حاضری اس اساس پر مبنی ہونی چاہئے کہ ہمارا تعلق سارے انسانوں سے ہے اور ہم پوری انسانیت کی نجات کے لئے تگ و دو کرنے والے ہیں نیز اس بنیاد پر کہ ہم پوری انسانیت کے سلسلے میں ہمدردانہ رویہ اختیار کرنے اور پوری نوع انسانی کے ساتھ لطف و کرم کا معاملہ کرنے پر مامور ہیں۔

بلاشبہ اللہ تعالیٰ سارے عالم کا رب ہے۔ تمام مسلمانوں کا رب ہے، جیسا کہ وہ اہل یورپ و امریکہ اور تمام لوگوں کا رب ہے۔ اس نے ایک ایسی عالم گیریت کا وعدہ کیا ہے جو اپنی ہمہ گیری اور وسعت میں مغرب کی ہمہ گیر اور آج کی دنیا پر حکمرانی کرنے والی مرکزیت کے بالمقابل ہوگی۔ جس طرح ہماری پہلی عالم گیریت ہیلینی اور رومی عالم گیریت کا متبادل اور نظیر تھی، اسی طرح ہماری متوقع اسلامی عالم گیریت بھی مغرب کی ہمہ گیر مرکزیت کا متبادل ہوگی اور یہ اسی وقت ہوگا جب ہمیں یہ معلوم ہو کہ ہمیں کس طرح مناسب انداز میں اپنی قرآنی منہجیت کے بنیادی ذرائع کا استعمال کرنا چاہئے تاکہ ہدایت اور دین حق تمام ادیان پر غالب ہوں یا مغرب اسلام کی دریافت کر کے اس کو اختیار کرنے میں ہم پر سبقت لے جائے اور اپنی محدود عالم گیریت کا

''دوسری اسلامی عالم گیریت'' سے تبادلہ کرلے، کون جانتا ہے؟!

ہماری عالم گیریت کوئی تعصب کی عالم گیریت نہیں ہے، نہ یہ کوئی ایسی دعوت ہے جو مغربی عالم گیریت کے بالمقابل کسی انسانی اور جغرافیائی امتیاز پر مبنی ہو۔ یہ تو ہمارے اور اہل مغرب کے لئے برابر کی سطح پر اور پوری دنیا کے لئے ''رحمت'' کی عالم گیریت ہے۔ اس کی تفصیل کے لئے ہم مندرجہ ذیل امور کی وضاحت کرسکتے ہیں:

اول: یہ ایک ایسی اسلامی عالم گیریت ہے جس کے لئے علیم وخبیر ذات نے اپنے علم کی روشنی میں فضا ہموار کی ہے تا کہ اس کا فیض سارے عالم کے لئے عام ہو۔ کیونکہ دنیا کو ان بے شمار سیاسی، اقتصادی، فکری اور ماحولیاتی مسائل سے چھٹکارا حاصل کرنے کی ضرورت ہے جو مغرب کے حکمراں تہذیبی نظام کی ناکامی کے نتیجہ میں پیدا ہوگئے ہیں۔ لہذا اسلامی عالم گیریت کو اللہ تعالی نے اپنے ہمہ گیر پیغام کی روشنی میں تیار کیا ہے تا کہ پوری انسانیت کو اس کا مخاطب بنایا جائے اور اسے ہلاکت اور اس انجام بد سے نجات دلائی جائے جو اس کا منتظر ہے۔ کیونکہ آج روئے زمین پر جو کچھ بھی ہو رہا ہے وہ توحید، تزکیہ، تعمیر اور عدل مطلق کی اقدار کے خلاف ہے۔

دوم: ہماری امت کو چاہئے کہ اس عالمی پیغام کے ذریعہ ساری دنیا کو مخاطب کرے اور اسے مغربی تہذیب کی مختلف شاخوں سمیت موجودہ تہذیب کے سامنے پیش کرتے وقت ہمارا زاویہ نظر دعوت یا مشنری کا نہیں ہوگا، نہ ''اسلامی قومیت'' سے وابستہ افراد کی تعداد میں اضافہ کی خواہش ہوگی بلکہ یہ کام ہم اس لئے کریں گے کہ اس وقت انسانی، سماجی، ثقافتی اور اخلاقی تمام رویوں پر مغربی تہذیب کی حکمرانی ہے اور اس کی وجہ اس کی عالم گیر تکنیکی مرکزیت اور اس کے رائج علوم ہیں۔ لہذا یورپ اور امریکہ میں پھیلے ہوئے مغربی علمی اور فلسفیانہ مکاتب فکر کے ساتھ جن میں مختلف ذہن و دماغ کی پرورش و پرداخت ہوئی ہے، مذاکرات کے لئے بہتر فضا تیار کرنے کی ضرورت ہے۔ یہی وہ مکاتب فکر ہیں جن سے جدیدیت اور مابعد جدیدیت کے

رجحانات پیدا ہوئے ہیں۔

صرف ''اسلامی عالم گیریت''ہی مغرب کی بے چینی کو دور کرسکتی ہے اور اس کا رخ درست کرسکتی ہے۔امت مسلمہ کی نجات بھی اسی میں ہے کہ وہ اس عالم گیریت کی حامل ہوجائے اور اسے اختیار کرلے۔مسلمان ذہن کو اپنے تمام احوال و کوائف میں یہ پہلو اپنے پیش نظر رکھنا ہوگا تا کہ وہ آج کی دنیا تک مناسب اسلامی پیغام پہنچا سکے اور اہل اسلام اور دنیا کو اس بات کا ادراک ہوسکے کہ قرآن اور اسلام آج کی دنیا کے لئے کیا کچھ پیش کرسکتے ہیں۔

سوم: یہ ایک ایسی متوقع اسلامی عالم گیریت ہے جس کا منظر عام پر آنا یقینی ہے۔اس مشن کو مسلمان انجام دے سکتے ہیں اور اگر وہ اس فریضہ کی ادائیگی سے گریز کریں گے تو غیر مسلم بھی اس تحریک کو برپا کرسکتے ہیں۔ہم اگر اس وقت اس کے لئے جدوجہد کا آغاز کریں گے تو ہمیں یہ کام روئے زمین کی خلافت اور شہادت علی الناس کے منصب اور مشن سے وابستہ ہوکر کرنا ہوگا۔ہماری طرف سے انسانوں کے تعلق سے اس فرض کی ادائیگی دراصل اس احساس کے تحت ہوگی کہ ہم اللہ تعالی کے سامنے جواب دہ ہیں۔اسی میں ہماری آزادی بھی مضمر ہے۔لہذا ہمیں یہ فرض ادا کرنا ہے۔کیونکہ اللہ تعالی کا یہ فیصلہ ہے کہ ہم اس سلسلہ میں جو کچھ بھی کریں گے وہ ایک پیغام ہوگا،ایک ذمہ داری ہوگی اور ایک ایسی امانت ہوگی جو اللہ تعالی نے ہمارے سپرد کی ہے،اگر ہم پیغام الہی کی کماحقہ تبلیغ نہیں کریں گے اور لوگوں تک اس کی روشنی اور ہدایت کو پہنچانے کا حق ٹھیک ٹھیک ادا نہیں کریں گے تو ہماری صورت حال پہلی ہی جیسی رہے گی یا ہوسکتا ہے کہ پوری انسانیت کے ساتھ ساتھ ہماری بھی حالت مزید ابتر ہوجائے اگرچہ مسائل اور مشکلات کی نوعیتیں الگ ہوں کیونکہ پس ماندگی کے مسائل اور ہیں،ترقی کے مسائل اور ہیں۔

یہ مولائے کریم اور رحمان کے بندوں کے درمیان لین دین کا تعلق ہے۔یہ اگرچہ ہمارے لئے نیک نامی کا ذریعہ ہے مگر یہ ہمارے لئے دوسروں کے مقابلہ میں فخر وغرور کا باعث

نہیں ہے۔ ہمارے لئے یہ روا نہیں ہے کہ ہم لوگوں کے سامنے عطائے ربانی پیش کرتے وقت ان پر احسان جتائیں نہ دوسرے کو ہمارے بارے میں خلاف واقعہ خیالات رکھنے چاہئیں۔ ہمیں دوسروں کو کچھ عطا کرنے کے بعد ان پر مسلط نہیں رہنا چاہئے بلکہ اس بات کے لئے کوشش اور جدوجہد کرنا ہمارا فرض ہے کہ ہماری طرف سے پیش کردہ اللہ تعالی کی باتیں قبول عام حاصل کریں۔ ہمارا تہذیبی نظام ہمیں تاریخی سند بھی فراہم کرتا ہے، کیونکہ ہم نے کسی کو غلام بنا کر اس سے اسلام کے عظیم الشان دارالسلطنت مدینہ منورہ میں جو ہمیشہ سے ایک عظیم الشان مقام رہا ہے، فلک بوس عمارتیں تعمیر نہیں کرائیں، نہ ہم نے کسی کو اس بات پر مجبور کیا کہ وہ ہمارا دین اختیار کرے، ہم نے کسی سے بیگار نہیں لی۔ ہم نے توحید کے سوا کوئی پیغام نہیں پیش کیا۔ ہم نے روئے زمین پر انسانوں کے درمیان عداوت، مخالفت اور کش مکش کو ہوا نہیں دی۔ ہم نے اس مکروہ عمل کو اپنے مادی مفادات کے لئے بھی استعمال نہیں کیا، ہم نے ماحول کو کبھی تباہ نہیں کیا، نہ زمین کو تخریب سے دوچار کیا، نہ خشکی و تری اور فضا میں فساد پھیلایا بلکہ ہم نے ایک ایسے طریقہ سے تمام تہذیبی اور ثقافتی نظاموں کو اپنایا کہ نہ اس سے پہلے اس کی مثال ملتی ہے اور نہ اس کے بعد اس جیسا کوئی نمونہ سامنے آیا۔ ہم اس کی طرف پہلے بھی اشارہ کر چکے ہیں، مغربی تحقیقات سمیت تمام تاریخی تصنیفی مطالعات اس کی تائید کرتے ہیں۔

یورپ اور مغرب کی مرکزی تہذیب جو ہمہ گیریت میں تبدیل ہو چکی تھی، اپنی عالم گیریت میں مستحکم تھی، وہ روئے زمین کے جن حصوں کو محیط تھی وہ جاپان سے شروع ہو کر، وسطی ایشیا کو عبور کرتے ہوئے جو اس وقت سویت کہلاتا تھا اور مغربی یورپ سے گذرتے ہوئے شمالی اور جنوبی امریکہ تک پھیلے ہوئے تھے، روئے زمین کا کوئی گوشہ ایسا نہیں جو اس عالم گیریت سے متاثر نہ ہوا ہو اور جہاں یہ اپنی ثقافت کے ساتھ نہ پہنچی ہو۔

یہ ہم مسلمانوں کا فریضہ ہے کہ حالات و ظروف کی ابتری کے باوجود ہم خود بھی ہدایت

اور دین حق کے قافلہ میں شامل ہوں، اور دوسروں کو بھی اس میں شامل کریں۔ امریکہ اور یورپ یعنی ان دونوں کی ہمہ گیر اور عالم گیر مرکزی تہذیب کا اپنے سلسلے میں خود بھی یہ احساس ہے اور ان کے فلاسفہ بھی انہیں اس سے آگاہ کر رہے ہیں کہ وہ اب اپنے کو اور اسی طرح دنیا کو اپنی طرف آنے والے بحران سے نکالنے پر قادر نہیں ہیں۔ کیونکہ انہیں مندرجہ ذیل بنیادی مسائل کا سامنا ہے:

اول: مغربی تہذیب کو مزید ٹکنالوجیکل ترقی درکار ہے۔ یہ وہی ترقی ہے جو پہلے اور دوسرے صنعتی انقلاب کے نتیجہ میں وجود پذیر ہوئی تھی۔ دوسری طرف یہ تہذیب تسلسل کے ساتھ سماجی، تہذیبی اور قدری انحطاط و زوال سے دوچار ہے۔ تکنیکی ترقی کے نتیجہ میں کوئی انسانی ترقی نہیں ہوئی بلکہ اس کے مقابلہ میں پہلے بھی اور اب بھی انسانی زوال و انحطاط ہی پیش آتا رہا ہے، اس وقت تک مغربی تہذیب اس مسئلہ کے حل میں ناکام رہی ہے جو ایسا لگتا ہے کہ اس کے لئے ایک چیستاں بن گیا ہے، کیونکہ ہر سطح پر رونما ہو رہی تہذیبی ترقی کو لازماً فقی اور صعودی ہونا چاہئے اور ٹھیک اسی وقت یہ بھی ضروری ہے کہ انسان اس ترقی کے حسب حال اقدار و اخلاق کی سطح پر بھی ترقی کرے، جیسا کہ انسانی تکنیک حسب ضرورت و حاجت ترقی کرتی ہے، لیکن مغربی تہذیب کے ساتھ جو کچھ ہو رہا ہے وہ اس کے بالکل برعکس ہے۔ علوم ترقی کر رہے ہیں، انسان زوال پذیر ہو رہا ہے، اس کی قدریں مفقود ہوتی جا رہی ہیں، اس کے مصائب، اس کی لوٹ کھسوٹ اور اس کے المیوں میں اضافہ ہو رہا ہے اور اگر آپ چاہیں تو گیارہ ستمبر کے واقعات اور اس کے نتیجہ میں پیدا شدہ صورت حال پر غور کر لیجئے۔

دوم: تاریخ کو کنٹرول کرنے کی تمام تر کوششیں غیر مؤثر ثابت ہوئی ہیں، اگرچہ اس سمت میں پہلی اور دوسری جنگ عظیم سے پہلے بہتر توقعات کے ساتھ بہت سی کوششیں کی گئی تھیں، چنانچہ اس وقت ہر شخص پر امید تھا اور اسے یہ توقع تھی کہ یہ جنگ یعنی جنگ عظیم اول دنیا کی سب

سے آخری جنگ ہوگی لیکن ابھی پہلی جنگ کے ختم ہوئے دو دہائیاں بھی نہیں گذری تھیں کہ دوسری جنگ کے شعلے بھڑک اٹھے اور انسان اس دوسری جنگ میں پہلی سے زیادہ خوں خوار درندہ بن گیا تو آخر دوبارہ اس کے برپا ہونے سے کیا چیز مانع ہوسکتی ہے؟ بلکہ دنیا میں ہر جگہ چھڑی ہوئی چھوٹی چھوٹی جنگوں سے ہونے والے نقصانات اپنے ریکارڈ کے اعتبار سے تین یا اس سے بھی زائد عالمی جنگوں سے پیدا شدہ نقصانات سے زیادہ ہو چکے ہیں، پھر بھی تاریخ کو کنٹرول کرنے کا ربانی منہج جیسا کوئی منہج نہیں ہے۔ جو کچھ بھی ہو رہا ہے وہ محض کش مکش، اس کے ذرائع اور وسائل میں تبدیلی ہے، جہاں تک کش مکش اور انسان کی لوٹ کھسوٹ کا تعلق ہے تو اس کا سلسلہ جاری ہے، خواہ اس کے ذرائع کتنے ہی بدل گئے ہوں۔ دنیا کے مختلف گوشوں میں جاری محدود چھوٹی اور مقامی جنگیں ایسی جنگوں میں تبدیل ہوسکتی ہیں جو وسیع پیمانے پر تباہی پھیلانے والے ہتھیاروں کے استعمال کے ذریعہ روئے زمین اور اس پر آباد لوگوں کا کلی صفایا کر دیں۔

سوم: ''مرحوم اشتراکی'' اور ''متوقع سرمایہ دارانہ'' دونوں نظاموں میں انسان پر قابو پانے کی ہر کوشش کے نتیجہ میں انسان نے بغاوت کی راہ اختیار کی ہے اور اس کا سلسلہ اب بھی جاری ہے، چنانچہ جب انسان مادہ پرستانہ ہمہ گیریت کے دائرہ میں اپنی شخصی قدر کی تلاش کرتا ہے تو وہ اپنی قومیت کی طرف پلٹتا ہے اور جب اسے اپنے وجود سے متعلق تاریخی دفتر کی جستجو ہوتی ہے تو وہ اپنے مذہب کا سہارا لیتا ہے۔ سوویت یونین میں یہی ہوا۔ دوسری طرف لبرل ازم اور مغرب کے وضعی نظام کے دائرہ میں انسان کو سوائے منتشر، جزوی اور تفریق و امتیاز پر مبنی تصور کے کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ درحقیقت لبرل ازم اس کو اس کے سوا کچھ دے بھی نہیں سکتا۔ انسان اپنی شخصیت کی تلاش کرتا ہے مگر جب اسے نہیں پاتا تو خواہشات اور جزوی امور میں پڑ کر اپنی ذات کو اپنی ذات کے سانچہ میں ڈھال لیتا ہے پھر وہ بحران سے دوچار ہوتا ہے اور خاندانی بنیاد سمیت ہر چیز سے علاحدگی اختیار کر لیتا ہے، چنانچہ اب آزادی بے مقصد ہوتی ہے۔ انسان کسی چیز کا پابند نہیں

ہوتا، کوئی خاندان نہیں ہوتا جس کی طرف اس کا انتساب ہو۔زندگی میں اس کا کوئی شریک نہیں ہوتا جس کی وہ پناہ لے سکے۔اس کی کوئی اولاد نہیں ہوتی جس کے تعلق سے وہ پدرانہ شفقت سے پرجذبات اور ماں کی مامتا کا اظہار کر سکے۔ یہ ایک ایسی آزادی ہے جس کی انتہا شخصیت کی موت، منتشر شخصیت، تباہی اور ہلاکت ہے۔مارکس نے روٹی کی خواہش کی اسے روٹی مل گئی، آئنسٹائن نے انرجی کی تمنا کی اسے انرجی مل گئی، ڈارون نے ارتقاء کی آرزو کی اس نے ارتقاء کو پالیا، اب اس کے بعد کیا ہوا؟ یہ تو وجود کا خاتمہ ہے، مایوسی سے، بے مقصد، بے معنی، بے ہدف زندگی سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لئے خودکشی کرنا ہے۔

چہارم: موجودہ تہذیبی نظام کی بنیاد کش مکش اور طاقت ور کے غلبہ پر ہے۔اس میں ہر چیز پر یہاں تک کہ معمولی درجہ کے اشتہارات کی سطح پر بھی بڑی بڑی کمپنیوں کا تسلط اور ان کی حکمرانی ہے، ان کمپنیوں نے ہر چیز کو وہ صارفانہ رخ دے دیا ہے جس نے انسان کو کتا بنا دیا ہے:"إن تحمل عليه يلهث أو تتركه يلهث" (اعراف:۱۷۶)( کہ تم اس پر حملہ کرو تب بھی زبان لٹکائے رہے اور اسے چھوڑ دو تب بھی زبان لٹکائے رہے)۔اب اگر مغرب کا کوئی شخص یہ محسوس کرتا ہے کہ وہ مکمل طور پر لٹ چکا ہے تو اس میں حیرت کی کیا بات ہے۔وہ تو ہر شعبہ زندگی میں موجودہ تہذیب کے دباؤ کے تحت ہی رہ رہا ہے۔اسی میں "تعلیم" کا وہ نمونہ بھی شامل ہے جو اس نے اپنے بیٹے کے لئے منتخب کیا ہے، نیز کھانے، چکھنے، چھونے اور پیشے کی انواع واقسام بھی ہیں، اس کا ہر عمل ان تمام چیزوں کے دباؤ کے تحت ہی ہوتا ہے۔

اگر ہم زمانہ ماضی سے لے کر اب تک ان موضوعات پر سیاہ کئے گئے صفحات کی قدر پیمائی کرنا چاہیں تو کر سکتے ہیں۔اس کے بہتر ثبوت اور شواہد موجود ہیں۔اگر ہم ان شواہد کا تذکرہ کریں اور انہیں فلسفیانہ اور علمی اسلوب میں مرتب کریں تو ہم پر موجودہ عالمی تہذیب کے بحران کی حقیقت واضح کرنے والے مندرجہ ذیل موضوعاتی عناصر اور اسباب منکشف ہوں گے:

اول: مسیحی الہیات: ہیلینی اور رومی تہذیبی روایات کے ذریعہ لٹ جانے کے بعد ان کے اندر اتنی طاقت نہیں رہ گئی کہ یہ ایک مغربی ذہن کو ''مجسم'' خدا کے تصور سے بالاتر کوئی کائناتی بصیرت عطا کر سکیں۔ اسی صورت حال کے ذریعہ مسیحی الہیات نے توحید کی شفافیت کا خاتمہ کر کے اسے مشرکانہ حلولی عقیدہ میں تبدیل کر دیا۔ اس نئے عقیدہ نے فلسفیانہ فکر کے مطابق نیچر سے بالاتر ایک کائناتی تصور کا خاتمہ کر دیا۔ اب انسان کی عقلی کاوش و محنت ایک تنگ ''وضعیت'' کے دائرہ میں محصور ہو کر رہ گئی، کیونکہ الوہیت یعنی اللہ کا تصور جو ''پہلی عالم گیریت اور کائناتیت'' کی اساس ہے، مختصر اور محدود ہو کر ایک طبعی ''شئی'' کی سطح تک آ گئی تھی، لہذا مسیحی الہیات بجائے خود موجودہ مغربی فکر کے سنگین مسائل میں سے ایک اہم مسئلہ ہیں، اس بحران سے مغربی فکر کے نکلنے کی واحد صورت یہ ہے کہ قرآن مجید کے مطابق ''توحید خالص'' کے نمونہ کی دریافت کی جائے تا کہ وہ مسیحی الہیات سے پیدا شدہ اس گلا گھونٹ دینے والے بحران کے حصار سے نکل سکے۔ لہذا اگر موجودہ مسیحی الہیاتی نقطہ نظر کے مطابق مذہب کی طرف واپسی ہوگی بھی تو وہ شخصیت کے محدود دائرہ سے آگے نہیں بڑھے گی۔ مسیحی الہیات کا گم شدہ فلسفیانہ عنصر ''اللہ اکبر'' ہے جو ''الوہیت'' اور توحید کے تصور کی شفافیت اور ستھرے پن کی نمائندگی کرتا ہے یہی تہذیبوں کے مسائل، تہذیبی غرور اور تعصب کا حل بھی پیش کرتا ہے۔ ''اللہ'' کی تکبیر کی معنویت بے انتہا گہری ہے، لیکن بیشتر لوگ اسے سمجھ نہیں پاتے ہیں۔ کیونکہ اگر توحید اور ذات الٰہی کے نقائص سے پاک ہونے کے تصور کی نفی ہو جائے تو معبود ''مجسم'' اپنی مخلوق میں حلول کرنے والا فطرت کے اعتبار سے انسان یا اس کے مشابہ یا ان میں متشکل قرار پاتا ہے اور معبود کی تجسیم کے تہذیبی تصور میں یہ اشارہ مضمر ہے کہ وہ بحیثیت معبود اپنی پیدا کردہ انسانیت کی ''تصدیق و تسلیم'' کا محتاج ہے۔ یہی وہ تصور ہے جس سے گریز کرتے ہوئے متکلمین باری تعالیٰ کو ہر غرض سے پاک اور مبرا قرار دیتے تھے۔ کیونکہ غرض اللہ تعالیٰ کو انسان کا محتاج بنا دیتی ہے اگر چہ اس کے پس پشت یہی جذبہ کیوں نہ کار

فرما ہو کہ انسان اللہ تعالی کے حضور اپنی عقیدت و وفاداری کے نذرانے پیش کرے اور انسان اپنے کو خدا کی ذات میں اس لئے متجسم کرے کہ اسے معبود کی قوت حاصل ہو جائے۔ ایسا انسان جب متجسم معبود کی قوت سے بے نیاز ہو گا تو وہ اس سے آزاد ہو جائے گا، اس کی ہدایات اور اس کے قوانین کی خلاف ورزی کرے گا اور سرکش ہو جائے گا۔ مغربی تہذیب میں یہی ہوا ہے، کیونکہ وہاں معبود کو کچھ کرنے اور اثر انداز ہونے سے روکا گیا ہے اور جب وہ ان کی بنیاد پرستی کے دائرہ میں اپنی سابقہ پوزیشن کی طرف واپس آنا چاہتا ہے تو وہ اس سے مطالبہ کرتے ہیں کہ وہ ان کے طریقہ کے مطابق واپس آئے۔ لہذا مسیحی الہیات ہی ''موجودہ مغربی تہذیبی بحران'' کی جڑ اور بنیاد ہیں، اس سنگین فکری مسئلہ کا حل صرف اسی طرح ممکن ہے کہ مغربی تہذیب کے سامنے ''اللہ احد'' اور ''اللہ اکبر'' کا تصور اس غرض سے پیش کیا جائے کہ وہ اسے قبول کرے، کیونکہ اللہ تعالی کے ہر طبیعی زمان و مکان سے بالاتر ہونے کی وجہ سے ان دونوں میں سے کوئی بھی چیز اس کے اختیارات کو سلب نہیں کر سکتی ہے، خواہ وہ اشیاء کے سلسلے میں انسانوں کو دی گئی معجز قوت فعلیہ ہی کیوں نہ ہو'' جیسا کہ حضرت مسیح علیہ السلام کو حاصل تھی''، یہیں سے یہ بات بھی سمجھ میں آتی ہے کہ خلق اور تکوین الہی کی منہجیت اور ''شیؤ'' (یعنی اشیاء کا بنانا اور ان کے کاموں کا تعین) کی منہجیت کے درمیان فرق ہے اور چونکہ مسیحی الہیات توحید سے نا آشنا ہیں اور ان کا ''اللہ اکبر'' پر ایمان نہیں ہے، اس لئے ان کے نزدیک خود خلق کا تصور بھی گڈمڈ ہو گیا ہے اور اسی طرح خلق کی منہجیت بھی واضح نہیں ہو سکی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ مغربی فکر نے اپنے مخصوص طریقہ پر علوم طبیعی کے فلسفے خلق کئے، یہ طریقہ اتنا ناقص اور نامکمل ہے کہ اس نے اس فلسفہ کو ایسا مبہم اور پیچیدہ بنا دیا ہے کہ قریب قریب اس کا ادراک کرنا یا اس کو سمجھ پانا ناممکن ہے، اس میں الوہیت کے عنصر کو فہرست سے خارج کر دیا گیا ہے یا اس سے جان بوجھ کر غفلت برتی گئی ہے جس کے نتیجہ میں یہ طریقہ اپنے اندر

وسعت و پھیلاؤ کے بہت سارے امکانات سے محروم ہو گیا ہے۔

دوم: عقل طبیعی اور اس کے بعد عقل علمی: جب مسیحی الہیات کی قید سے آزاد عقل طبیعی حکمراں ہو گئی اور عقل علمی نے الہیات سے علمی سطح پر قطع تعلق کی حد تک پہنچے ہوئے نظریات سے اس کی تائید کی تو "مغربی ثقافت" وجود پذیر ہوئی اور اس موقع پر مسیحی الہیات سے ترک قطع کا مسئلہ "ثقافت" کے تصور یا "جانب داری" کے موقف پر مرکوز ہو گیا، اب مادہ پرستوں نے ترک تعلق کے مسئلہ کو اس لئے طول دینا چاہا تا کہ ایک ایسے مکتب فکر کی بنیاد رکھی جائے جس کی رو سے اللہ تعالی کی الوہیت کے تصور کو کنارے لگایا جا سکے جب کہ وضعیت پرستوں نے "اللہ تعالی کی الوہیت کے تصور کو وجو ہی سے مٹا دینے کی غرض سے اس تصور کو الگ تھلگ کرنے والی ترغیبات کا سہارا لیا، یہ دو مغربی عقلوں یعنی طبیعی اور علمی کے معکوس نتائج "سلبی اور ایجابی" کا پہلا مظہر ہے۔ یعنی مسیحی الہیات سے قطع تعلق، دوسرا مظہر اس سے بھی زیادہ سنگین نوعیت کا حامل ہے۔

سوم: انتشار اور جدیدیت اور مابعد جدیدیت کے دونوں ہی ادوار میں ربط و تسلسل قائم کرنے کی صلاحیت سے محرومی: جب تنگ نظر مسیحی الہیات کے مقابلہ میں طبیعی اور علمی دو ذہنیتیں پروان چڑھیں تو علمی ذہنیت تنقید و تجزیہ کے تمام اسلحہ سے مسلح ہو کر ہر چیز کی "ماروائیات" کے گہرے تجزیہ اور بحث و تحقیق میں لگ گئی۔ وہ تہذیب کی مصنوعی منطق پر عمل کرتے ہوئے ہر بات کو اس کی بنیاد اور اصول کی طرف پھیرتی تھی یعنی ہر مادہ کی اس کے اولین اجزاء اور عناصر میں تجزی اور تقسیم۔ یورپ کی مغربی تہذیب اپنے دونوں دھڑوں یعنی مشرقی جو منتشر اور مرحوم ہو چکا اور متوقع مغربی سمیت، اس تجزی اور انتشار میں کامیاب ہوئی اور بڑے بڑے معرکے سر کئے یہاں تک کہ مغرب اس سطح پر پہنچ گیا جسے آج "فضائی حملہ" کے نام سے جانا جاتا ہے، حالانکہ یہ ہمارے اسلامی تصور کے مطابق تسخیر ہے نہ کہ حملہ لیکن سوال یہ ہے کہ اس تہذیب نے ربط قائم

کرنے میں کیا کامیابی حاصل کی؟

انہوں نے مادہ اورانرجی سے متعلق ترکیب و ربط کے فن میں کامیابی حاصل کی مگر انسان کے سلسلے میں ایسا کرنے سے قاصر رہے، اس لئے نہیں کہ انسان طبیعت سے الگ کوئی وجود ہے بلکہ ان عوامل کے نتیجہ میں جن کا ہم نے گذشتہ سیاق میں ذکر کیا، چنانچہ مغربی زندگی کو یا زیادہ مناسب الفاظ میں مغرب کی مرکزی تہذیب کو ترکیب اور ربط کے بحران کا سامنا کرنا پڑا۔

## کش مکش اور باہمی عداوت:

اس کے بعد یوروپی مغربی تہذیب کی ترکیب سے متعلق ایک سنگین مسئلہ سامنے آتا ہے۔اس مسئلہ کا تعلق ''تہذیبی نظام اور تاریخی نیز سماجی ارتقاء کی تشکیل وتاسیس'' سے ہے، کیونکہ مغرب کے تہذیبی نظام نے، جیسا کہ ہم ہیلینی اور رومی ادوار میں اس کے تاریخی پھیلاؤ ہی کے زمانہ سے اس کی تشکیل کی وضاحت کر چکے ہیں، کش مکش اور دوسروں پر غالب آنے ہی کی بنیاد پر اپنی شخصیت کی تشکیل وتعمیر کی، لہذا مغرب کا تہذیبی نظام باہمی عداوت پر مبنی ہے۔اس کی بنیاد یہی اس پر ہے کہ مختلف طاقتیں قوت کی منطق کا سہارا لے کر غالب آنے اور ہر چیز پر کنٹرول حاصل کرنے کی کوشش کریں۔یہی وجہ ہے کہ اس نظام میں اخلاق کی دعوت دینا مشکل ہے الا یہ کہ وہ اخلاقی دعوت قوت اور اصلاح پیدا کرنے کی تاثیر سے عاری ہو۔ایسی صورت میں تو آپ جس چیز کی چاہیں اور جس طرح چاہیں دعوت دے سکتے ہیں لیکن آپ اقتصادی یا اجتماعی سطح پر کوئی ایسا کام نہیں کر سکتے جو ''گلوبلائزیشن'' کی حکمراں قیادتوں کے مفادات سے متصادم ہو یا ان کے اقتصادی فلسفہ اور ان کی سماجی فکر سے مختلف پالیسی اور پروگرام سامنے لاتا ہو۔کیونکہ یہ تمام چیزیں یقینی طور پر ان کے مصالح سے متصادم ہیں۔یہی وجہ ہے کہ ''قدیم عالمی نظام'' اور پھر ''جدید عالمی نظام'' نے بھی مختلف اقوام وملل کے امتیازات کے کلیۃ خاتمہ کر دینے کو اپنا ہدف قرار دیا۔امریکہ، عالم عرب اور عالم اسلام کے مسائل کی اصل بنیاد یہی ہے۔

یہاں بھی مسئلہ ''تہذیبی نظام'' ہی کا سامنے آتا ہے۔ یہ مسئلہ مذہب یا اخلاق یا تعلیم کا نہیں ہے، چنانچہ مغرب بمعنی ''مغربی تہذیبی نظام'' ہمیں اس بات کی اجازت دیتا ہے کہ ہم اس ملک میں اور اس سے باہر بھی مذہب کے بارے میں جو چاہیں کہیں، اگرچہ اس کے نزدیک بھی بہتر یہی ہے کہ آپ ایک مغربی شخص کے پسندیدہ طریقہ کے مطابق حضرت مسیح کی دعوت دیں۔ اس میں بھی کوئی حرج نہیں کہ آپ دوسرے جس مذہب کی چاہیں دعوت دیں جیسے اسلام، بدھازم، زرتشتی یا سکھ مذہب، لیکن جب آپ کی یہ دعوت وسیع ہو کر نظام وقت تک پہنچ جائے گی تو پھر اس کا شمار ''مخالفانہ سیاسی تیاری، بنیاد پرستی، تعصب، انتہاء پسندی اور دہشت گردی'' میں ہو جائے گا۔

ان تمام تفصیلات کے بعد جو سوال سامنے آتا ہے وہ یہ ہے کہ ایسی صورت حال میں اسلام کی عالم گیریت اور امریکہ نیز اس کی مرکزیت کی زیر قیادت مغرب کی عالم گیریت کے درمیان ہم آہنگی پیدا کرنے کے لئے ہمیں کیا کرنا چاہئے؟!!

ہمیں جو کچھ کرنے کی ضرورت ہے وہ آسان نہیں ہے، اس کے مندرجہ ذیل اسباب ہیں:

اول: مغرب ان تمام کیفیات و احوال سے گذر رہا ہے جن کا بالتفصیل ہم نے ذکر کیا اور وہ شدت کے ساتھ کسی بھی قسم کی اصلاح کی مخالفت کرے گا خصوصاً جب اس اصلاح کا مأخذ کوئی مذہبی فکر ہو اور اس وقت تو اور زیادہ اہتمام اور سختی کے ساتھ جب اس کا محور کوئی دینی اور اسلامی فکر ہو، کیونکہ مغرب کے پاس ایک عقلی اور طبیعی سرمایہ موجود ہے اور اس کا یہ سرمایہ مسیحی الٰہیات کی ضد واقع ہوا ہے۔ اسی طرح اس کا ایک تاریخی ریکارڈ ہے جو براہ راست اسلام سے کش مکش کے عوامل اور محرکات سے پر ہے۔ مغرب اس دشمنی میں مسیحی الٰہیات اور قرآن مجید کے درمیان محض ظاہری اور سرسری فرق کرتا ہے۔

دوم: مغرب کا تہذیبی نظام اخلاق و اقدار پر مبنی ایسے پیغامات کو قبول نہیں کرے گا جو اس کے اپنے سماج نیز سیاسی اور اقتصادی طور پر اس کے اثر و رسوخ کے تحت رہنے والی اقوام پر مسلط اس کے تہذیبی نظام کو متاثر کرتے ہوں، خاص طور پر سوویت یونین کے زوال کے بعد، کیونکہ مغربی نظام نے سوویت یونین کے زوال کو لبرل نظام کے درست ہونے کی سند اور اپنے موقف کے صحیح ہونے کا ثبوت قرار دیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بعض اوقات جب کسی شخص پر دینی سزاؤں کا نفاذ ہوتا ہے تو ہم دیکھتے ہیں کہ اس پر ہسٹریائی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ لہذا یہ مسئلہ ''حقوق انسانی'' سے اتنا متعلق نہیں ہے جتنا کہ تہذیبی تصادم سے۔

سوم: اصلاح کو جو پیغام بھی خاص مسلم دنیا کی طرف سے پیش کیا جائے گا اسے مغرب اپنے مذکورہ پس منظر اور تاریخی ریکارڈ کی بنا پر فریق مخالف کی طرف سے پیش کی گئی چیز ہی قرار دے گا جس کے بارے میں مغرب کے بیشتر حکمرانوں کا خیال ہے کہ اس کے خلاف صف آراء ہونا اور اس کی مخالفت کرنا ضروری ہے۔ ہوگا یہی، خواہ ہم مغرب کو مطمئن کرنے کی کتنی ہی زیادہ کوشش کیوں نہ کر ڈالیں۔

تو پھر کرنا کیا ہے؟

مذکورہ تمام باتوں کے باوجود کچھ راستے کھلے ہیں، ان میں سے چند یہ ہیں:

اول: مغربی تہذیب تجزیاتی انتشار، ربط و ترکیب کی اہلیت نہ ہونے، انسان، زندگی اور تاریخ کے سلسلہ میں اپنے نقطہ نظر اور ان دیگر افکار کے نتیجہ میں جنہوں نے اسے "End" (خاتمہ) کے نظریات سے دوچار کر دیا ہے، ایک سخت بحران سے گذر رہا ہے۔ ہم چونکہ قرآن مجید کی بدولت ''قرآن کے علمی منہج'' کے ذریعہ ربط و ترکیب کی قدرت رکھتے ہیں، اس لئے ہماری اولین، بہت بنیادی اور بے انتہا ضروری ذمہ داری ہے کہ ہم مغرب کے تجزیاتی مراکز سے تعلقات کو مضبوط و مستحکم کریں، خواہ ان کے رجحانات اور نظریات کچھ بھی ہوں۔ یہ وہ مراکز

ہیں جن کی فکری، ثقافتی اور فلسفیانہ بنیادیں روز بروز وسیع سے وسیع تر ہوتی جارہی ہیں۔ یہ مراکز ہی مغرب سے ہمارے علمی ربط و تعلق کی کلید ہیں، کیونکہ ہم تنہا اور محض قرآن مجید کے ذریعہ ان مراکز کو ''قرآنی علمی منہج'' سمیت کائناتی بصیرت اور اس بصیرت کی روشنی میں ربط و ترکیب کی قدرت عطا کر سکتے ہیں۔ ہمیں یہی کرنے کی ضرورت بھی ہے۔

دوم: ہمیں اپنی تمام تر امکانی صلاحیتیں اسلام کے تہذیبی تناظر کی تعلیم دینے والوں پر نیز علوم و معارف کے سرچشموں کی تلاش اور علم کو اسلامی رخ دینے یا ''اسلامائزیشن آف نالج'' پر مرکوز کرنی چاہئے، خصوصاً مناہج، نمونوں، طبیعی علوم کو رخ دینے اور سماجی اور انسانی علوم کی تشکیل نو کے میدانوں میں۔ اپنی کائناتی وحدت میں ان علوم کا ارتقاء بیشتر اہل مغرب کے اندر اس بات کی تحریک پیدا کرے گا کہ وہ ہمارے منہج پر کھلے ذہن سے غور کریں یا خود اس کی دریافت کریں یا اس سے استفادہ کریں پھر اسے ترقی دے کر قرآن مجید کی دریافت کی بلندی تک پہنچا دیں۔

سوم: یہ چیز ہمارے سامنے مغرب کے سرکردہ گروہ اور منتخب طبقہ تک پہنچنے کا راستہ کھولے گی اور ایک علمی اور منہجی دائرہ میں ان سے مذاکرات کی راہ ہموار کرے گی۔ اس سلسلے میں اگر ہمیں کسی ہتھیار سے مسلح ہونے کی ضرورت ہے تو وہ صرف قرآن مجید کے فہم پر مبنی شعور ہے، اس کا کبھی نہ ختم ہونے والا فیض ہے اور اس کے وہ عجائبات ہیں جن کو فنا نہیں۔ اس طرح دوسری متوقع اسلامی عالم گیریت کی نئی کلید ایک ایسی علمی اور منہجی کلید ہوگی جو موجودہ دور کی عالمی علمی منہجی میزان پر ساری دنیا کے اہل علم کو چیلنج کر سکنے کی پوزیشن میں ہوگی۔ ایک ایسے وقت میں جب ہم مغربی ذہن تک رسائی حاصل کرنے کے لئے کسی راشتہ کی تلاش میں ہوں، ہمیں رنجشوں کو ہوا دینے والے نعروں کی پالیسی سے گریز کرنا چاہئے اور نظریاتی اسلامی پالیسی کے تسلط سے آزاد ہو کر ''علمی اسلامی پالیسی'' کی تشکیل کے معیار تک پہنچنے کی کوشش کرنی چاہئے۔ اس کے لئے ہمیں قرآن مجید کی منہجیت اور اس کی علمی حیثیت کو بنیاد بنا کر اپنے پاس موجود سرمایے کو ایسی تحقیقات

اور سنجیدہ علمی مطالعات کی صورت میں پیش کرنا چاہئے جو موجودہ دنیا کے مسائل، مشکلات اور پیچیدگیوں کو زیر بحث لاتے ہوں۔اسی طرح ہمیں مسائل دنیا کے بعض گوشوں کی تحقیق سے متعلق سنت میں موجود رسول اللہ ﷺ کے منہج کو اساس بنانا چاہئے۔قرآن مجید میں اس سنت کی طرف اشارات موجود ہیں یا یہ قرآن کی محکم آیات سے مربوط ہے۔یہاں ایک بار پھر اس پہلو پر نظر ڈالنے کی ضرورت ہے کہ بیشتر دینی تحریکات اور خود اسلام کے اندرونی نظام میں اس اہم کردار کا ادراک کرنے اور اس ادراک کے بعد اس کردار کو ادا کرنے کی کتنی صلاحیت اور قوت ہے۔

دینی تحریکات جن کے مختلف تنظیمی ڈھانچے روایتی، تاریخی اور ثقافتی جواز کی بنیاد پر قائم ہیں، اپنے افکار و خیالات میں ماضی کی اسلامی تاریخی صورت حال کی طرف مائل ہیں، گویا انہوں نے ہر مسئلہ میں اپنی حقیقی صورت حال کو نظر انداز کر دیا ہے اور قدیم صورت حال کو اپنے پیش نظر رکھا ہے اور جب کبھی یہ تحریکات اس روایتی سرمایہ کا صورت حال پر انطباق کرتی ہیں تو بیش تر ان کا انطباق جامد منطق پر مبنی ہوتا ہے جس میں قرآنی نص کی خصوصیات اور بطور خاص ''اس کی اطلاقیت'' پر بہت زیادہ توجہ نہیں دی جاتی ہے۔یہ جمود پرستانہ منطق اس صورت حال کو بھی اسی طرح دور اول کے فقہاء کے تعمیر کردہ ڈھانچوں اور فریم میں فٹ کرتی ہے جس طرح اس صورت حال سے وابستہ سنت کی نصوص کو، فقہاء نے ان ڈھانچوں کی تعمیر و تشکیل ایک علمی، منہجی معیار، متعین زمانی خصوصیات اور ان تاریخی صورت حال کے تناظر میں کی ہے جن کی کما حقہ توثیق نہیں ہوئی ہے، چہ جائے کہ ان کا مطالعہ اور تجزیہ، یہ تحریکات ان ڈھانچوں کے سلسلے میں ایسی تجزیاتی کوششوں سے گریز کرتی ہیں جو اندرون سے ان کے مطالعہ میں معاون ہوں، داخلی سطح پر تناظر کا مطالعہ ان زبردست تبدیلیوں کے سمجھنے اور ان کا جائزہ لینے میں معاون ہوگا جو انسانی تعامل، زمان و مکان کے تغیرات اور انقلابات و تبدیلی کے فطری عوامل کے نتیجہ میں ان ڈھانچوں میں ہوتی رہی

ہیں ۔اس کا فائدہ یہ ہوگا کہ تعامل کے غیر منقطع اور غیر مختتم سلسلے پر مبنی سیاق میں مقامی اور عالم گیر صورت حال کے درمیان تاثیر و تاثر کی قدر و قیمت ، دائرہ اور حدود اربعہ پر توجہ مرکوز کرنے میں کامیابی ملے گی۔

اگر مغربی تناظر رکھنے والا بحران ایمان باللہ، وحی اور غیب کو نظر انداز کرنے کی وجہ سے ربط و تسلسل کی قوت سے محروم اور ایک انتشار کا بحران ہے تو اسلامی تناظر کا حامل بحران بھی ایک ہمہ گیر تہذیبی سرمایہ سے تعامل کو منضبط کرنے والی ایسی منہجیت کی عدم موجودگی کی صورت میں واضح اور نمایاں ہے جو اپنی ایک وجہ جواز رکھتی ہو۔اگر جمود پرستانہ منطق کی رو سے اس تہذیبی سرمایے سے تعامل کی کوئی وجہ جواز موجود نہ ہو، خواہ اس تعامل کی نوعیت، توضیحی ہو یا تاویلی یا تطبیقی، تو یہ تحریکات اس تہذیبی سرمایہ کے نقد و تجزیہ کے سلسلے میں قرآنی تصدیقات کے ذرائع کا استعمال کرنے سے قاصر رہتی ہیں ۔اسی طرح وہ اس بات کے تعین سے بھی قاصر رہتی ہیں کہ اس تہذیبی سرمایہ کے کون سے اجزاء دوبارہ قابل قبول ہو سکتے ہیں اور کن اجزاء کو مسترد کر دینا مناسب ہوگا۔ یہ تحریکات اس تہذیبی سرمایہ پر قرآن کو بالادست بنانے کی بھی اہلیت نہیں رکھتیں، الغرض تبدیلی کے منہجی ذرائع کی تشکیل کرنے والی اس ترکیب سے محروم ہیں جو آج علمی سطح پر مفقود ہے۔

چونکہ اسلامی تحریکات اسلامی علمی منہجیت کے ذریعہ تبدیلی لانے سے قاصر ہیں اس لئے وہ تشدد کا سہارا لیتی ہیں اور اسلام کی منہجیت، نیز غیب، انسان اور کائنات کے درمیان ہم آہنگی کی ضرورت کے سلسلے میں اسلام کے نقطہ نظر سے دور جا کر دعوت اسلامی کی اشاعت کے اولین دور کی تاریخی صورت حال کے متعلقات پر جم جاتی ہیں اور تمام معاملات کو غیب کے سپرد کر دیتی ہیں یا ولایت فقیہ کے تصور کے ساتھ یا اس کے بغیر بھی ''حاکمیت'' کو اللہ کی طرف منسوب کر کے اقتدار پر جھپٹنے کی کوشش کرتی ہیں، پھر وہ اسلام کے تعزیری قوانین اور بطور خاص حدود کی تنفیذ کے ذریعہ اللہ تعالی کو خوش کرنے کے بعد اس کا فیصلہ جاننا چاہتی ہیں ۔اسلام کے لئے ضرر رساں اس پھیلاؤ

اور بڑے پیمانہ پر اس کے سمٹاؤ کے ذیل میں ہی سارے سیاسی پروگرام اور پروجیکٹس کی تشکیل کی جاتی ہے۔ پروجیکٹس کے تیار کرنے والے زور دے کر کہتے ہیں کہ ان کے ذریعہ اسلام کی نمائندگی اور اس کی ترجمانی ہوتی ہے نیز یہ کہ اگر وہ اسلامی قوانین کے نفاذ کی غرض سے اقتدار تک پہنچے تو اس کے نتیجہ میں زمین عدل وانصاف سے اس طرح بھر جائے گی جس طرح اس سے پہلے ظلم وجور سے بھری ہوئی تھی۔ اسی طرح تحریکات نے بڑے عجیب وغریب طریقہ سے اسلام کے مسائل کو اور اپنے قومی وعلاقائی مسائل کو ایک دوسرے سے خلط ملط کر دیا ہے۔ چنانچہ یہ کبھی اسلام کو ایک قومی دین میں تبدیل کر کے اسے ان امی اقوام کے دائرہ تک محدود کر دیتی ہیں جن کو اپنی پہلی عالم گیریت کی تشکیل کے وقت اسلام نے غلامی سے نجات دلائی تھی۔ کبھی یہ تحریکات اسلام کو کسی پارٹی یا طبقہ کے سیاسی پروگرام میں تبدیل کرا دیتی ہیں۔ اسی طرح کبھی یہ اسلام کو ایک ایسے دین میں تبدیل کر دیتی ہیں جس کا مظہر چند علاقائی مسائل قرار پاتے ہیں جیسے سعودی عرب اور خلیج عربی میں امریکہ کی موجودگی یا ۴/جون ۱۹۶۷ء سے پہلے کی سرحدوں سے متعلق مسئلہ فلسطین یا عراق پر پابندی یا کشمیر وغیرہ کا مسئلہ۔ یہ مسائل ان تحریکی حضرات کی نظر میں کبھی کبھی اتنی اہمیت اختیار کر لیتے ہیں کہ اسلام اس جنگ کا محض ایک ہتھیار قرار پاتا ہے جو کسی اسلامی ملک کے ذریعہ لڑی جا رہی ہو۔ جیسا کہ ''القاعدہ'' کا عمل رہا ہے، کیونکہ بقول ابن لادن اس گروپ کا خیال تھا کہ عنقریب لوگ ''دو خیموں'' میں بٹ جائیں گے۔ اسلام کے مزاج سے سب سے زیادہ ناواقف اور بے حد تکلیف دہ حد تک اس کی اہانت کے مرتکب وہ خبیث یا غبی لوگ ہیں جو یہ سمجھتے ہیں کہ ''ورلڈ ٹریڈ سینٹر'' کی عمارت اور ''پنٹاگن'' کے ایک حصہ کے انہدام سے لوگوں کے فوج در فوج اسلام میں داخل ہونے کے دروازے چوپٹ کھل چکے ہیں۔

بہت پہلے کہا جا چکا ہے:

**ما يفعل الأعداء في جاهل ما يفعل الجاهل في نفسه**

(ایک نادان شخص کے سلسلہ میں دشمن جو کارروائیاں کرنے والے ہوتے ہیں وہ تمام کارروائیاں ایک نادان اپنے سلسلے میں خود کرلیتا ہے)

پوری دنیا کو اس بات کا اطمینان ہو چکا ہے کہ اسلامی تحریکات اور اسلامی قوتیں تبدیلی کے ذریعہ تمام نظام ہائے حکومت اور اقتدار کو نشانہ بنانا چاہتی ہیں۔ ان میں وہ حکومتیں بھی شامل ہیں جن کے دائرے اور حدود میں اور جن کے سیاسی جواز کے تحت یہ تحریکیں اپنا کام کرتی ہیں اور اس بات سے صرف نظر کرلیتی ہیں کہ وہ شریعت یا شارع سے ماخوذ بھی ہیں یا نہیں۔ یہ تحریکات کم سے کم لوگوں کی نظر میں تبدیلی کے ذریعہ وسیع یا محدود جمہوری رخ رکھنے والی تکثیریت پسند لبرل حکومتوں کو یا یک جماعتی اور ہمہ گیر چھاپ رکھنے والی اشتراکی حکومتوں کو، ان کی موجودگی کی صورت میں نشانہ بناتی ہیں اور شاہی حکومتوں کی مخالفت سے خواہ وہ دستوری ہوں یا مطلق العنان، آگے نہیں بڑھتی ہیں۔ ان تحریکات میں سے بعض کا خیال ہے کہ ان کی جدوجہد کا سب سے اہم مظہر یہ ہے کہ وہ عالم اسلام کی طرف سے مسترد کردہ حکومتوں کے ملکوں کی کسی چیز یا ان کے کسی فرد کو نقصان پہنچائیں۔

اسرائیل ''ایک مخصوص عالم غیب'' کی تعمیر کے لئے یہودی دماغ کی تمام تر صلاحیتوں کا استعمال کرتے ہوئے اپنے کو وجود عطا کرنے میں کامیاب ہوگیا۔ یہ ''مخصوص عالم غیب'' ایک یہودی شخص کو دوبارہ فعالیت عطا کرنے اور اسے ایک قومی و مذہبی جذبہ کے تحت نیز ''یہودی عیسائی'' اور مغربی معجون مرکب کے ذریعہ ایک مملکت کی تعمیر کے رخ پر ڈالنے کے لئے موزوں ہے۔ اسرائیل نے اپنے قیام میں کامیابی حاصل کرنے کے بعد ہی ایک ایسی ''وسیع البنیاد حکومت'' کی تشکیل کے بارے میں غور و فکر کرنا شروع کردیا جو نیل اور فرات کے مابین تمام علاقوں کو محیط ہو اور اس میں مدینہ و خیبر کو نہ تو بچا رکھا گیا ہو اور نہ انہیں نظر انداز کیا گیا ہو۔ کیونکہ اہمیت اس کی ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے سیر کردہ تمام علاقے یہودی تاج کے زیر نگیں

ہوں تا کہ ایک ایسی عالم گیریت وجود میں لائی جا سکے جس کا مرکز و محور ''اسرائیل'' ہو۔ اسرائیل اپنی تسلط پسند اور معجون مرکب غیبی دینا کے ساتھ یورو پی اور کمیونسٹ تجربے کو کامیاب تجربات کے طور پر دیکھنے لگا۔ اس کا خیال تھا کہ یہ تجربات مطالعہ و تحقیق کے مستحق ہیں اور یہ کہ ان سے درس عبرت لینے اور مزید تجربات اخذ کرنے کی ضرورت ہے۔ اسرائیل کے اندرونی و بیرونی تحقیقاتی اور مطالعاتی مراکز ''ایک عالمی گاؤں'' کے تصور پر بحث و تحقیق سے کبھی نہیں رکے، البتہ ان کا خیال یہ ہے کہ اس ''عالمی گاؤں'' کو ان کی زیر قیادت ہونا چاہئے۔ یہ مراکز اپنی تحقیقات کے ذیل میں اس کا بھی مطالعہ کرتے رہے ہیں کہ اس تصور کے نمایاں کرنے میں مذہب، جذبہ، آرٹ، شخصی، علمی اور ثقافتی اضافیت وغیرہ کیا کردار ادا کر سکتے ہیں اور یہ کہ ایک مدت بعد ہی سہی کس طرح اس تصور کو امکان اور وجود کی شکل دی جا سکتی ہے۔ ہمیں اس میں کوئی شک نہیں کہ ان مراکز کی تمام تر کوششوں کا انجام اللہ کے حکم سے ناکامی ہی ہے۔ ان کا حشر بھی ہرگز یورو پی کلیسا کی کوششوں اور دینی کی بجائے ''عقلی عالم گیریت'' کا نعرہ دینے والی روشن خیال تحریک کے حشر سے اچھا نہیں ہوگا، ان کا انجام اس مادہ پرستانہ تحریک کے انجام سے مختلف نہیں ہوگا جس نے مادہ اور تاریخ کی مادی تعبیر کو اپنی ہمہ گیریت یا فرد اور طبقہ کی عالم گیریت کے قیام کی بنیاد بنایا تھا۔ اس تحریک کے قیام پر سات دہائیاں بھی نہیں گذری تھیں کہ یہ ایک قصہ پارینہ اور ناکام و نامراد تاریخ کا ایک جزء بن گئی۔

اسرائیل نے منظم اقدامات کی صورت میں عالم گیریت سے متعلق اپنے افکار و خیالات پیش کرتے ہوئے ایک ایسے ''علاقائی نظام'' کا تصور پیش کرنا شروع کر دیا ہے جس کے ذریعہ پیش رفت کرنے کا ایک ''وسیع البنیاد نظام'' وہ وجود میں لانا چاہتا ہے۔ شمعون پیریز عرب علاقے اور ''علاقائی نظام'' پر گفتگو کرتے ہوئے کہتا ہے:

''دنیا کے اس خطہ کا مسئلہ تنہا کسی ایک حکومت کے ہاتھوں یا حتی کہ دو فریقی یا متعدد

فریقی سطح پر بھی حل نہیں ہوسکتا!! علاقائی تنظیم وتشکیل ہی امن وسلامتی کی کلید ہے۔ اس سے جمہوریت کے فروغ، اقتصادی ترقی، قومی خوش حالی اور انفرادی ارتقاء کو تقویت حاصل ہوگی لیکن یہ انقلاب کسی جادوگر یا کسی ڈپلومیٹک پیچ سے نہیں آجائے گا بلکہ امن وسلامتی کا استحکام تصورات میں انقلاب کا متقاضی ہے اور یہ کوئی آسان کام نہیں مگر اس کے باوجود یہ ایک ضرورت بھی ہے، اس کے بغیر جو غلبہ بھی ہم حاصل کریں گے وہ مختصر مدتی ہوگا۔ ہمارا آخری نشانہ اقوام (یعنی مشرق وسطی) پر مبنی ایک ایسے علاقائی خاندان کی تشکیل ہے جس کی منڈی یوروپی یونین کے طرز پر مشترک ہو اور جس کے اپنے منتخب مرکزی ادارے ہوں'' (۱)۔

''لیگ آف نیشنز'' قائم ہوئی اور ختم ہوگئی۔ ''اقوام متحدہ'' بنی اور اس کے تحت بہت سے ادارے تشکیل دیئے گئے جن میں سرفہرست ''سلامتی کونسل'' ہے۔ یہ تمام ادارے بھی امریکہ اور اسرائیل کے ہاتھوں فی الواقع ختم ہوچکے ہیں اگرچہ وہ ظاہراً باقی ہیں۔ کیونکہ ان تمام اداروں نے دنیا کے ان تمام تقاضوں اور ضروریات کی ترجمانی نہیں کی جو تسلسل کے ساتھ برقرار رہیں بلکہ صرف بڑی طاقتوں کی ضروریات کی ترجمانی کی لیکن چاہے صورت حال کچھ بھی ہو ان اداروں کا وجود آج بھی اس بات کی نمائندگی کررہا ہے کہ انسانی فطرت میں ''عالم گیریت'' کی جڑیں مضبوط اور اس کا رجحان مستحکم ہے بلکہ اب تو ایسے رجحانات واضح طور پر سامنے آنے لگے ہیں جو ملکوں کے قومی اقتدار اعلیٰ کی اہمیت کم کرنے والے ہیں، سرحدوں پر زر صرف کرنے کے خیالات کو رد کرنے والے ہیں اور مشترک سیاسی واقتصادی تعلقات کے مفاد میں اقتدار اعلیٰ کے اختیارات سے دست برداری کے لئے آمادہ کرنے والے ہیں۔ اس وقت شدت کے ساتھ اقتدار اعلیٰ اور

---

۱- ملاحظہ ہو: شمعون پیریز کی کتاب ''الشرق الاوسط الجدید'' قاہرہ ایڈیشن ۱۹۹۵ء، فصل چہارم۔ غور کرنے کی بات ہے کہ گیارہ ستمبر کے واقعات کے بعد ہی بتدریج امریکہ کو اس رخ پر لانا ممکن ہوا کہ وہ اس پورے منصوبہ کو روبہ عمل لائے اور اس مقصد کے لئے جس الیہ او رحادثہ کو بطور ہتھیار استعمال کیا گیا وہ یہ تھا کہ امریکہ کی سلامتی زد میں ہے اور امریکی قوم کو خطرات لاحق ہیں تو کیا بن لادن، ابو حفص اور ملا عمر کو اس کا ادراک ہوا؟!!

قومیت پر اصرار کرنا اور اپنے آپ میں محدود ہو کر رہ جانا پس ماندہ قرار دی گئی اقوام اور حکومتوں کا حصہ قرار دیا جا چکا ہے۔ بلاشبہ امریکی تجربہ نے ان افکار و خیالات کے دروازے چوپٹ کھول دیئے ہیں۔

بین الاقوامی تعلقات، بین الاقوامی قانون اور عالمی رجحان کے میدان میں مغرب کا فکری سرمایہ اپنے ظاہری تصورات و نظریات کے برعکس اپنے جوہر کے اعتبار سے بڑا تہی دامن ہے۔ اسی لئے ایک ایسے سرمایہ کی سنجیدہ تلاش و تحقیق کی لہر شروع ہوئی جو موجودہ دنیا کے عالمی رجحان کو مالا مال کر سکے، خواہ اس کے لئے قدیم تہذیبوں سے نظریات مستعار ہی کیوں نہ لینے پڑیں۔

لیکن بے انتہا افسوس کی بات ہے کہ متعدد اسباب و وجوہ کی بنا پر اسلام اس بحث و تحقیق کے دائرہ سے یا تو خود خارج ہے یا اس کو خارج کر دیا گیا ہے۔ ایسے میں علماء اور مسلم مفکرین کی ذمہ داری بہت بڑھ جاتی ہے، یہ ذمہ داری بہت اہم بھی ہے اور اسی کے ساتھ صعوبتوں سے پر بھی، لہذا "عالم گیریت" کے شعبہ سے متعلق اسلام کی عظیم تر صلاحیتوں اور توانائیوں کو منظر عام پر لانا ان کا فرض ہے، کیونکہ اسلام کی اعلیٰ اقدار، شارع کے مقاصد، کائنات، انسان اور زندگی ان سب سے متعلق اسلام کا نقطہ نظر ایک منضبط نظام اور ایسے علمی نمونے پیش کرنے کے ضامن ہیں جو انسانی وحدت کو ممکن بنانے والی مشترک اقدار اور بنیادی اصولوں کو نمایاں کرنے اور ان کو منظر عام پر لانے کی بھرپور طاقت رکھتے ہیں۔ یہ انسانی اخوت کے زیر سایہ ہدایت، حق، توحید، تعمیر، تزکیہ، انصاف، آزادی اور مساوات کی قدریں ہیں۔ ان قدروں کا ستون اور ان کا مظہر پیغام اسلامی کی عالم گیریت، کتاب اللہ کی حاکمیت، نبوت کی تکمیل، آسانی اور ہمدردی پر مبنی شریعت، جدلی انقلاب احوال اور نوعی تغیر کے کائناتی نظام سے استفادہ، قرآنی علمی منہجیت نیز زمان و مکان پر اثر انداز ہونے والے جملہ عوامل کا استعمال ہے۔ امت مسلمہ ان تمام ذرائع کا

استعمال کر کے نقطہ نظر ہی کی سطح پر اور نظریاتی دائرہ ہی میں سہی متوقع نمونہ پیش کر سکتی ہے۔

## کیا فقہ کا بھی کوئی کردار ہے؟

اس میدان میں فقہی وسعت اور کثیر الاطراف اور بھرپور فقہی ذخیرہ جس کی اہمیت اپنی جگہ مسلم ہے، بہت زیادہ مفید نہیں ہوگا، خواہ اس کے لئے آسانی کی راہ اختیار کی جائے یا شدت کی۔ اس کی بجائے جو چیز مطلوب ہے، وہ یہ کہ کائناتی کتاب ''قرآن مجید'' کی نصوص کا از سر نو جامع مطالعہ کیا جائے، اس طریقہ کی جستجو کی جائے جس کو آپ نے اس عظیم کتاب سے تعامل میں اختیار کیا تھا اور دیکھنے کی کوشش کی جائے کہ آپ نے کس طرح قرآنی اقدار اور اپنے زمانہ کی صورت حال کو ایک دوسرے سے مربوط کیا تھا۔ اس کی ضرورت اس لئے ہے تا کہ سنت نبوی کی صورت میں موجود اس تعامل کو ایک ایسی منہجیت میں تبدیل کیا جا سکے جس کا موضوع قرآنی اقدار کو نبی ﷺ کے زمانہ کی صورت حال اور آپ ﷺ کے ماحول سے مربوط کرنا ہو، پھر اس فرق کا گہرائی سے مطالعہ کیا جائے جو اس مستند زمانہ اور بعد کے زمانوں کے درمیان واقع ہوا۔ اسی طرح بعد کے زمانوں میں پیش آمدہ نوعی تغیرات کو بھی پیش نظر رکھا جائے تا کہ منہج کے مختلف زاویے سامنے آ سکیں اور نوعیت کے اعتبار سے ایک تبدیل شدہ صورت حال پر مصادر کتاب و سنت کی تطبیق کی منہجیت دریافت ہو سکے۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ ہم اپنی ''اسلامی عالم گیریت'' کو اس قابل بنا سکیں کہ وہ مختلف تہذیبی نظاموں اور متنوع ثقافتی نمونوں کو اپنے اندر سمو سکے اور دنیا کو تفرقہ و انتشار کے رجحانات سے نجات دلا سکے۔ اسی طرح بطور خاص بعد کی صدیوں میں انسانیت کو تسلسل کے ساتھ پیش آنے والے انقلابات سے پیدا شدہ تاریخی نظریات کا استعمال ہو سکے۔ اس سلسلہ انقلابات کی آخری کڑی ''مواصلات اور روابط'' کا انقلاب ہے۔ اس مواصلاتی انقلاب نے اور اس سے پہلے کے تکنیکی انقلاب نے دنیا کو ایک ہمہ گیر عالم گیریت اور ایک مکمل نامیاتی انسانی وحدت کی طرف تیز تیز قدموں سے چلنے والا بنا دیا۔ اب اس عالم گیریت

اور وحدت کے متعلق گفتگو یا اس کی بہتر سے بہتر شکل کی تلاش باعث حیرت نہیں رہ گئی، نہ اس کے بارے میں سوچنا کوئی خیالی عمل قرار پایا، خصوصا غلط تصور پر مبنی اس ''گلوبلائزیشن'' کے بعد جس کے بارے میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ اس کا بنیادی مثبت پہلو یہ ہے کہ اس نے عالم گیریت کے بارے میں غور و فکر کو اجنبی اور ناممکن باقی رہنے نہیں دیا نہ اسے خیالی پلاؤ قرار دیا۔

جب ان نظریات کا استعمال کیا جائے گا اور اس بات کا ادراک کیا جائے گا کہ یہ نظریات اس طویل تاریخی انقلاب احوال کی دین ہیں جس کا سفر انسان کے مختلف تہذیبی نظام قدیم تہذیبوں کی ابتداء ہی سے کرتے آئے ہیں نیز یہ ان پر کسی کی اجارہ داری نہیں ہے بلکہ یہ انسان کے اس خوابیدہ جذبہ کی ترجمانی کرتے ہیں جو اپنی ترجمانی کے لئے مناسب مواقع کا منتظر ہوتا ہے تو اسلام کی اس اولین تحریک کی صورت میں اسلام کے عالم گیر نقطہ نظر کی ترجمانی کا ایک موقع ہاتھ آئے گا جس نے بہت جلد اور اپنے آغاز ہی کے وقت دنیا کے بیچوں بیچ مشرق میں بحرالکاہل اور مغرب میں بحر اٹلانٹک تک کے علاقوں کو اپنے دامن میں سمیٹ لیا تھا اور اس طرح اس نے اسلام سے پہلے کی مروج ''مشرق و مغرب'' کی دوئی کو ختم کر کے اپنے منفرد منہج اور اپنے نمایاں تہذیبی نظام کے ذریعہ مختلف تہذیبوں، ثقافتوں اور نسلوں کو اپنے اندر سمو لیا تھا۔ وہ ایک انوکھی قسم کے کھلے پن کے ساتھ ان کی ثقافتوں اور فکری اور فلسفیانہ نظاموں سے ہم آہنگ ہو گئی تھی۔ اس کا نتیجہ اس عظیم تہذیبی و ثقافتی سرمایے کی صورت میں سامنے آیا جس کی نمائندگی اسلامی تہذیب نے ہر سطح پر کی۔

اتنے عظیم تاریخی سرمایہ کی حامل ''اسلام کی عالم گیریت'' کو یہ اندیشہ نہیں ہے کہ مغربی امریکی مرکزیت اس پر غالب اور قابض ہو جائے گی، کیونکہ اسے اچھی طرح اس بات کا ادراک ہے کہ یہ ایک مغربی بلکہ امریکی مرکزیت ہے اور یہ کہ یہ اپنے ''گلوبلائیزیشن'' کی صورت حال میں قریب قریب عالمی افکار و نظریات کو بے اثر بنانے والی ہے، کیونکہ مرکزیت عالم گیریت نہیں

ہے، نہ یہ عالم گیریت ہوسکتی ہے۔لہذا یہ ہرگز اس قابل نہیں کہ انسانیت کو انضمام و اتحاد کی منزل سے ہم کنار کرسکے۔اس زاویہ سے اس پر بیرونی دباؤ اور جبر کی حکمرانی ہے جس کی عملی صورت معاشیات کا گلوبلائیزیشن، کثیر ملکی کمپنیاں ''فاسٹ فوڈ'' (Fast Food)، ''جینز''(Jeans) اور امریکی طرز زندگی کی بالادستی ہے۔یہ درحقیقت ''گلوبلائزیشن'' ہے نہ کہ ''عالم گیریت''۔

افکار و نظام کی سطح پر ''گلوبلائزیشن'' اور اس کی امریکی قیادت بے حد پیچیدہ مسائل سے گذر رہی ہے۔اگرچہ اس کے مسائل ہمارے مسائل سے مختلف ہیں، کیونکہ یہ اس وقت سے شدید بے چینی کی کیفیت سے گزر رہی ہے جب سے اس نے مذہبی الہیات اور علم کے عقلی مسلمات و مبادیات کے ٹکڑے کئے ہیں اور ان طبعی علوم کے مناہج سے متعلق اعتماد کو مجروح کیا ہے جن کو اس نے مادی جدلیت، ڈارون کے نظریہ ارتقاء، فرائڈ کے نفسیاتی تجزیات اور آئنسٹائن کی اضافیت کی روشنی میں اپنے ظاہری یا سطحی فطری قبائلی حدود میں رہ کر سمجھا تھا۔اس طرح مغرب خود اپنے طبعی علوم کے مناہج کو ان کی کائناتی حدود اور ان کی فلسفیانہ منزلوں تک پہنچانے میں ناکام رہا۔مغرب کو اس کی ضرورت اس لئے تھی تاکہ اپنی ''عالم گیریت'' کی بنیاد کو مستحکم کرسکے اور اسی کے ساتھ ساتھ اپنے مسائل سے چھٹکارے کے لئے کوئی محفوظ راستہ پاسکے۔آج مغرب کا حال یہ ہے کہ وہ پوری دنیا کے سمندروں اور اس کے سرمایے اور طاقت کے ذخائر پر کنٹرول حاصل کرکے اپنے مسائل کا رخ دنیا کے دیگر ملکوں کی طرف پھیر دینا چاہتا ہے۔بڑا فرق ہے مونا ہونے اور پھول جانے میں۔

مغربی تہذیب نے طبعی علوم کی مہ زور سواری کی لگام ڈھیلی چھوڑ دی مگر اپنے محدود وضعی فلسفوں کے دائرہ میں اس سے تعامل میں ناکام رہی۔اسی لئے اس کے مسائل کا سلسلہ بھی دراز ہوتا گیا۔

مارکسزم نے مغربی فکر کو اس کے فلسفیانہ اہداف دینے کی کوشش کی لیکن مارکسزم میں مسائل کا تناسب حل کے تناسب سے بہت زیادہ تھا، لہذا وہ زوال پذیر ہو کر ہمیشہ کے لئے فنا کے گھاٹ اتر گیا اور بحران پہلے سے زیادہ قوت کے ساتھ ابھر کر سامنے آ گیا۔

مغرب کا لبرل تہذیبی نظام اپنی موجودہ صورت میں ہرگز اس بحران کے خندق کو عبور نہیں کر سکتا۔ مغرب کے لبرل اور سرمایہ دارانہ نظاموں کی دنیا میں اس وقت خوشی کی لہر دوڑ گئی تھی جب سوویت یونین کا زوال ہوا تھا۔ ان نظاموں نے علی الاعلان اس کی موت کی تصدیق کی تھی اور اسے اپنی اس فکر اور اپنے اس نظام کی فتح قرار دیا تھا جس کے اگر مسائل نہ ہوتے تو مارکسزم وجود میں نہ آتا۔ ان نظاموں کو یہ نہیں معلوم کہ اس کا اصل سبب یہ ہے کہ جو نظام بھی اللہ تعالی اور غیب کو نظر انداز کر کے وضع کیا جائے گا وہ لازما اسی انجام سے دوچار ہوگا۔ وہ یہ نہیں سمجھ سکے کہ انسان کی وہ جدلیت جس کا دائرہ غیب اور فطرت تک وسیع ہے، ہر ایسے نظام کو اکھاڑ پھینکتی ہے جو انسانی جدلیت کے تغیر کو قبول نہ کرے، چاہے اس نظام کی نوعیت کچھ بھی ہو، خواہ وہ فطرت کے کائناتی نظام اور قوانین کو نظر انداز کر کے یا اس سے بالاتر ہو کر بنایا گیا لاہوتی نظام ہو یا مثالیت پر مبنی کوئی ایسا وضعی لاہوتی نظام ہو جو انسان کو زمانہ کے میکانزم کا تابع بنانے والا ہو یا کوئی ایسی مذہبی لاہوتیت ہو جس میں دین کے حقائق، اس تک رسائی کے ذرائع، اس کے منہجی عناصر اور اس کے ان حقوق کو ملحوظ نہ رکھا گیا جو وحی الہی اور کائنات دونوں کے مطالعہ کی جامعیت پر مبنی ہوں۔

## مختلف مسائل کا باہمی ربط:

دنیا کے مسائل باہم مربوط ہونے لگے ہیں، جیسے جیسے یہ مسائل باہم ملتے جائیں گے اور عالمی مسائل کی صورت اختیار کرتے جائیں گے ویسے ویسے ان کے مطلوبہ حل بھی عالمی ہوتے جائیں گے، اس کی وجہ یہ ہے کہ اب کسی بھی ملک یا قوم کے مسائل میں محض داخلی یا شخصی عناصر کارفرما نہیں رہتے۔ چنانچہ مواصلاتی انقلاب کے نتیجہ میں مختلف ملکوں کی اقتصادیات، ماحولیات،

اسٹریٹیجی، سیاسیات اور ثقافتوں کے درمیان پیدا ہونے والے ربط نے مخصوص تہذیبی نظاموں اور امتیازات کو ایسے چھوٹے چھوٹے اجزاء میں تقسیم کر دیا ہے جو ایک عالمی کلی ڈھانچہ کی صورت میں باہم مربوط ہیں۔اس میں اس سے بحث نہیں ہے کہ یہ باہمی ربط و تعلق ان اقوام کی اپنی مرضی سے اور ایک عالمی مستقبل کے سلسلے میں ان کی توقعات کے مطابق ہوا ہے یا اس میں اس میکانیکی اثر پذیری کی منطق کارفرما ہے جو اب کسی بھی ملک یا قوم کو اپنی ہم آہنگی کی قوت، مؤثر ذرائع اور نفوذ کی صلاحیت کے ساتھ امڈے آ رہے عالمی نظریات سے الگ تھلگ رہنے نہیں دے گی۔

سموئیل ہنٹنگٹن (Samuel Huntington) نے تہذیبوں کی کش مکش سے متعلق اپنی تحقیق یا اپنا نقطہ نظر تحریر کیا ہے(۱)۔اس نے یہ پیشن گوئی کی ہے کہ آنے والی دہائیوں میں ایک تہذیبی کش مکش برپا ہوگی۔یہ کش مکش جدید دنیا میں کش مکش کے آغاز و ارتقاء کا آخری مرحلہ ہوگی۔اس نے ان غیر مغربی اقوام اور حکومتوں کا بھی حوالہ دیا ہے جو مغربی کارروائیوں کے میدان اور ان کے نشانہ سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتیں۔اس نے یہ بھی ذکر کیا ہے کہ کس طرح اقوام اور حکومتیں بھی مغرب کے پہلو بہ پہلو تاریخ کے لئے ایک قوت محرکہ اور مسئلہ بن گئیں۔اس نے اپنی پیشن گوئیوں میں اس بات کو شامل کیا ہے کہ آنے والے دنوں میں دنیا کی تشکیل سات تہذیبوں کی ہم آہنگی یا ان کی کش مکش کے ذریعہ ہی ہوگی۔یہ تہذیبیں مندرجہ ذیل ہیں: ''مغربی تہذیب، جاپانی تہذیب، اسلامی تہذیب، ہندو تہذیب، آرتھوڈکس تہذیب، لاطینی امریکی تہذیب''۔اس میں ''افریقی تہذیب'' کو بھی شامل کیا جاسکتا ہے۔اس نے اسلامی تہذیب کو عربی، ترکی اور ملایوی تہذیبوں میں تقسیم کیا ہے۔اس نے فارسی اور ہندی تہذیبوں کو نظر انداز کیا ہے، اسی طرح اس نے اسلامی تہذیب کے زیر سایہ رہنے والی دیگر اقوام کا بھی ذکر کیا ہے۔اس نے مغربی تہذیب کو یورپی اور امریکی دو حصوں میں تقسیم کیا ہے اور اس نے تہذیبوں کے درمیان

---

۱- دیکھئے: مجلّہ "Foreign Affairs" شمارہ موسم گرما ۱۹۹۳ء، ''سموئیل ہنٹنگٹن'' کا مقالہ۔

اختلاف پر زور دیا ہے۔اسی طرح اس نے اس بات پر زور دیا ہے کہ تہذیبوں کے درمیان کش مکش کی حقیقت میں مذہب کا اختلاف مؤثر ہوگا جس کے بارے میں اس کا خیال ہے کہ کش مکش کی یہ قسم سب سے طویل اور سب سے زیادہ تشدد آمیز ہوگی۔اس نے اپنے اس اہم مقالہ میں جو بعد میں کتابی صورت میں شائع ہوا(۱)، متعدد ایسے تہذیبی مظاہر پر بھی نظر رکھی ہے جو قابل مطالعہ ہیں لیکن سادگی میں یا تنگ نظر کی بنا پر اس میں جو نقص پیدا ہوگیا ہے وہ یہ کہ اسلام اور اسلامی تہذیب وثقافت کے بارے میں مقالہ نگار کا نقطہ نظر استشراقی اور روایتی ہے۔اسی طرح مصنف اپنے مغربی تناظر نیز وہ مغرب اور امریکہ کی کش مکش اور تفرقہ واختلاف کی تہذیب سے اپنے انتساب کی وجہ سے باہمی عداوت اور رسہ کشی کے مغربی اور امریکی پہلو کو چھوڑ کر جو مغربی تہذیب کے ارتکاز کا محور ہے، تمام تہذیبوں، مذاہب اور ثقافتوں کے دیگر پہلوؤں پر غور کرنے سے قاصر رہا ہے۔

بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مصنف نے مذکورہ تہذیبوں کے نقشہ کا مطالعہ ۱۵۰۰ء کی دنیا میں رہ کر کیا ہے۔یہی وجہ ہے کہ اس نے تکنیکی انقلاب اور اس کے نتائج، اسی طرح مواصلاتی انقلاب اور اس کے اثرات کے گوشوں کو بحث وتحقیق کا وہ حق نہیں دی ہے جو فی الواقع ان کو دیا جانا چاہئے تھا۔اسی سے مصنف کو معلوم ہوتا کہ اقوام وملل اور ملکوں کے درمیان تعلقات پر ان انقلابات کے کیا اثرات مرتب ہوئے۔

اسی طرح مصنف نے بڑی حد تک اقتصادی علوم کے ماحولیاتی اثرات سے صرف نظر کیا ہے اگرچہ اس نے اس کی طرف سرسری اشارہ کیا ہے۔مصنف ماحول کے مشترک مسائل، اسی طرح ایک مشترک انسانی کنبہ کی نمائندگی کرنے والی کائنات کے مشترک مسائل کی بحث و

---

۱- کتاب کا نام ہے: "The Clash of Civilization"، اس کا مصنف "Samuel Huntington" ہے، یہ کتاب ۱۹۹۶ء میں نیویارک میں چھپی تھی۔

تحقیق میں ''روئے زمین کی پہلی چوٹی کانفرنس'' کے انعقاد کے نکتہ کو سمجھنے سے قاصر رہا ہے۔وہ اس ''سیکولر مغربی نمونہ'' کے ادراک سے بھی محروم رہا ہے جو قریب قریب مغرب کا ایک ہمہ گیر نمونہ ہے اور جس کے اثرات مذہب، تہذیب اور ثقافت سب پر مرتب ہوئے۔مصنف نے ''اسلام اور مغرب'' کے تصادم پر سارا زور صرف کیا ہے۔اس نے اس کے بہت سے واضح اشارات دیئے ہیں کہ کس طرح مغرب اسلامی تہذیب کے خلاف اپنی آئندہ کی جنگ میں فتح حاصل کرسکتا ہے اور وہ کس طرح اسلامی تہذیب کے خلاف اپنے ان اتحادیوں کو اپنے گرد جمع کرسکتا ہے جو اسلامی تہذیب کے خلاف اس کے برپا کردہ معرکہ کو فتح و کامرانی سے ہم کنار کرنے میں اس کی مدد کریں۔مصنف اسلام کی صرف اس تصویر سے واقف ہے جسے وہ کش مکش کی مغربی ڈائری کے ذخیرہ سے برآمد کرکے اپنے ساتھ لئے پھر رہا ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ تفکیر و تجزیہ کی یہ قسم اس جیسے مغربی مصنف کے لئے کوئی نئی چیز نہیں لیکن اگر مصنف نے ان عناصر کو اہمیت دی ہوتی جنہیں اس نے اہم نہیں سمجھا اور انہیں بحث و تحقیق کا وہ حق دیا ہوتا جس کے وہ مستحق ہیں، تو اس کے برعکس نتائج اس کے سامنے آتے اور اسے معلوم ہوجاتا کہ اس کی پیشن گوئی صحیح بھی ہوسکتی ہے اور غلط بھی، اگر دنیا ایک قطب کی حیثیت رکھنے والی امت کی زیر قیادت ایک آزادانہ تہذیبی نظام کے دائرہ میں اتحاد کی صحت مند بنیادیں تلاش کرنے میں ناکام رہی اور اسے قومی یا علاقائی یا مذہبی یا تنگ نظر مسلکی امتیازات پر مبنی اقدار کے بجائے انسانوں کے درمیان مشترک اقدار پر مبنی کوئی مرکز نہیں مل سکا۔ایک ایسے تہذیبی نظام کی قیادت کرنے والی امت لازماً پوری انسانیت کے درمیان مشترک مسلمات کی نمائندہ اقدار کی حامل ہوگی۔

ہدایت اور دین حق کی اقدار انسانیت سے اس کی فطرت کے مطابق معروف کا مطالبہ کرتی ہیں اور اسے اس منکر سے روکتی ہیں جس کو اس کی فطرت مسترد کرتی ہے، اس کے لئے

پاکیزہ چیزوں کو حلال قرار دیتی ہیں۔اس پر ناپاک چیزوں کو حرام ٹھہراتی ہیں اور اس پر سے ان بندشوں اور بیڑیوں کو دور کرتی ہیں جو اس پر لگا دی گئی تھیں۔اس طرح یہ قدریں انسان کو اس کائنات کا حکمراں اور اس کا خلیفہ بناتی ہیں۔یہ قدریں کائنات کو انسان کا ایک ایسا گھر بنا دیتی ہیں جو اسی کے لئے مسخر کیا گیا ہو۔یہ تمام انسانوں سے اپیل کرتی ہیں کہ وہ ان اقدار سے وابستہ ہو جائیں اور ایک ایسی تہذیب کے زیر سایہ ''پورے طور پر اسلام'' میں داخل ہو جائیں جو تمام انسانوں کو اس حیثیت سے دیکھتی ہے کہ وہ سب کے سب آدم کی اولاد ہیں اور آدم کی تخلیق مٹی سے ہوئی تھی نیز وہ سارے انسانوں کو اپنے اندر سمو لیتی ہے۔

جب ہم اسلام کی نعمت سے سرفراز ہونے والے مغرب ہی کے ایک شخص گارودی(Garaudy)اور ہنٹنگٹن(Huntington) کے درمیان تقابل کرتے ہیں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ گارودی اسلام کے نظریہ عمرانیات سے متاثر ہوا ہے۔اسی لئے اسے مختلف تہذیبوں کے درمیان کش مکش کی بجائے ایسے مذاکرات کی توقع ہے جن سے عالم گیریت کی راہ ہموار ہوگی اور اس کی فضا تیار ہوگی۔چنانچہ وہ زور دے کر کہتا ہے کہ: ''محققین جس چیز کو مغرب کے نام سے موسوم کرنے پر متفق ہیں وہ تو دراصل '' دجلہ وفرات'' اور ''مصر'' میں وجود پذیر ہوئی تھی۔اس کا وجود خلا سے نہیں ہوا تھا،اسی لئے اس نے مغرب پر اس بات کے لئے سخت تنقید کی ہے کہ وہ اسلامی تہذیب کے امتیازات وخصوصیات سے بطور خاص اور دیگر تہذیبوں کے امتیازی اوصاف سے عموماً ناواقف ہے۔اس نے مغرب کو اس بات کی دعوت دینے کی کوشش کی ہے کہ اسے اپنے ذاتی تجربہ کی روشنی میں اسلام کی تہذیبی خصوصیات کی تلاش وتحقیق کے لئے کوشاں ہونا چاہئے۔اس نے یہ بھی ذکر کیا ہے کہ اسلام سے پہلے اس کے شخصی مسائل بھی ویسے تھے جیسے مغرب کے ہیں،ایسا اس لئے ہے کہ یہ مسئلہ پیدا ہی اس کے مغربی تہذیبی انتساب سے ہوا ہے۔ اسی لئے اس کا خیال ہے کہ اگر مغرب کو اسلام کی دریافت ہو جائے تو یہی اس کے تمام مسائل کے

حل کا ضامن ہے، پھر اس نے عالمی سطح پر ایک ''ثقافتی انقلاب'' برپا کرنے کے سلسلے میں چند رہنما خطوط پیش کئے ہیں جن کا خلاصہ درج ذیل (۱) ہے:

۱۔مغربی دانش گاہوں اور یونیورسٹیوں میں دوران مطالعہ اور تحقیق غیر مغربی تہذیبوں کو کم از کم وہ درجہ دیا جائے جو مغربی ثقافت کے مساوی ہو(۲)۔

۲۔فلسفیانہ فکر پر نئے سرے سے غور کیا جائے، یعنی یہ کہ عملی تحقیقات کی خاطر گہرے فلسفیانہ فکری اور نظری تحقیقات و مطالعات کی اہمیت کم نہ کی جائے، جیسا کہ خاص طور پر امریکہ میں ہو رہا ہے۔

۳۔''علم جمالیات'' میں دلچسپی لی جائے اور اسے تکنیکی علوم کی اہمیت سے کم اہمیت نہ دی جائے۔

۴۔مستقبل سے متعلق تحقیقات پر زور دیا جائے اور ان کو صرف مغرب کی تاریخ سے مربوط کرنے کی بجائے عمومی انسانی تاریخ سے تسلسل کے ساتھ مربوط رکھا جائے، مغربی تاریخ غیر معروضی اسباب کی بنا پر تمام تہذیبوں کو پھلانگ کر اپنے آپ کو صرف ہیلینی اور رومی تہذیب سے جوڑنا چاہتی ہے۔

لیکن اگر ایک طرف گارودی اور اس جیسے دوسرے لوگ مغربی فکر کے ساتھ پیش آنے والے اپنے بحران کو اسلام کے ذریعہ حل کرنے میں کامیاب ہوئے ہیں تو دوسری طرف وہ ان

---

۱۔ دیکھئے: جاروی کی کتاب: ''حوار الحضارات'' قاہرہ ایڈیشن، دار الشروق، ۱۹۹۴ء، ص ۱۷۔

۲۔ اس موقع پر ہم "Michael Sells" اور اس کی کتاب "Approaching the Quran" کا ذکر کر سکتے ہیں۔ نارتھ کالورینا کی یونیورسٹی نے اس کتاب کو اپنے نصاب میں شامل کیا ہے۔ یہ کتاب تاریخ روایتی دائرہ میں بعض علوم قرآنی کو زیر بحث لاتی ہے۔ مصنف نے چونکہ انصاف پسندی سے کام لینے کی کوشش کی ہے، اس لئے اس نے قرآن کو برا بھلا کہنے، اس کا مرتبہ گھٹانے اور رسول اللہ ﷺ کی شخصیت کی اہانت کے ذریعہ اپنی بحث کی راہ ہموار نہیں کی ہے۔ اسی وجہ سے وہ ہنگامہ برپا ہوا جس نے مغربی ذہنیت اور نفسیات میں چھپے تعصب کو طشت از بام کر دیا۔ یہ تعصب اپنے ظہور کے لئے موقع کی تلاش میں رہتا ہے۔

مسلمانوں کے نئے مسائل کو حل کرنے پر قادر نہیں ہو سکے ہیں جو ہماری طرح موروثی طور پر مسلمان نہیں ہوئے (۱)، بلکہ ایک ایسے تہذیبی نظام سے آئے ہیں جو اسلام کے تہذیبی سرمایہ سے مختلف ہے۔ یہ مسلمان ہماری متوقع عالم گیریت کے اولین ثمرہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ جب کوئی شخص یہ دیکھتا ہے کہ یہ نئے مسلمان ہمارے تہذیبی سرمایہ سے جو اب ان کا اپنا سرمایہ بن چکا ہے، تعامل میں کن مسائل سے دو چار ہیں تو اسے ان پر رحم آتا ہے۔ وہ دیکھتا اور محسوس کرتا ہے کہ کس طرح اسلام قبول کرنے کے بعد اس کی صلاحیتیں معدوم ہو جاتی ہیں یہاں تک کہ وہ ایک ایسے ''غنوصی تصوف'' (فلسفہ اور مذہب کی آمیزش کا فکری رجحان) کے سمندر میں گم ہو جاتی ہیں جو اسلام کی دریافت سے قبل کی ان کی صورت حال سے بہت زیادہ مختلف نہیں ہوتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ لوگ اس تہذیبی انبار کے ذریعہ ایک ہمہ گیر صورت میں اسلام کے حقائق اور اس کی عالمی خصوصیات کی دریافت سے قاصر رہے ہیں۔ وہ عہد تدوین کی روایتی بندشوں میں جکڑی ہوئی

---

۱- جن لوگوں کو اسلام وراثت میں ملا ہے، ان کی تشفی کبھی تقلید سے ہو جاتی ہے، کبھی قیاس سے، کبھی تقدیر کے غلط فہم سے اور کبھی ایمان پر ایسے افتخار سے جس میں معروضی شرائط مفقود ہوتی ہیں۔ یہ تمام باتیں اس ''جمود پرستانہ ذہنیت'' کی خصوصیات ہیں جو علمی بے چینی کی راہ سے آشنا ہی نہیں ہے۔ جہاں تک ان نئے حضرات کا تعلق ہے تو یہ ایک ایسے پس منظر سے آنے والے لوگ ہیں جس میں مذکورہ طریقوں کے اختیار کرنے کی بہت زیادہ گنجائش ہے، یہی وجہ ہے کہ یہ لوگ تصوف کی ایک ایسی قسم کی طرف رجحان رکھتے ہیں کہ جو ممکن ہے ''سنی تصوف'' کے دائرے میں نہ آتا ہو۔ اسی لئے بیشتر اوقات ان کے اور موروثی مسلمانوں کے درمیان ایک قسم کا بعد یا شک یا ان کے اسلام اور ان کی استقامت کے سلسلے میں عدم اعتماد پیدا ہو جاتا ہے۔ اسی طرح ہم انہیں اپنے سے دور ہونے اور اپنے حلقوں سے علاحدگی اختیار کرنے پر مجبور کر دیتے ہیں۔ ''اسی بحث کو دیکھ لیجئے جواز ہر وغیرہ میں گارودی کے اسلام کے صحیح ہونے سے متعلق چھیڑی گئی'' جب کہ ہمارا فرض تھا کہ ہم ان کے طریقوں سے استفادہ کرتے ہوئے اس پر غور کرتے کہ ان کے خود اپنے نیز ہمارے تہذیبی سرمایے سے تعامل کا طریقہ کیا ہے؟ یہ مختلف مردہ اور زندہ عالمی تہذیبوں کے پس منظر سے آنے والے مستقبل کے اس مسلمان کی ایک تصویر ہے جو ''دوسری عالم گیریت'' کے عہد کا انسان ہے۔ اس کے علاوہ وہ افراد ہیں جو ہماری ثقافت، ہماری تہذیبی روایات اور ان کی تاریخی خصوصیات کے پس منظر سے اسلام قبول کرنے والے ہیں۔

موجودہ دور کی اسلامی فکر کے ذریعہ بھی ان حقائق اور خصوصیات کی تلاش میں ناکام رہے ہیں۔ یہ بندشیں اس فکر کو اس قابل رہنے ہی نہیں دیتیں کہ وہ ان خصوصیات کو اپنے سامنے، نیز ان نئے مسلمانوں کے سامنے پیش کر سکے۔

ان حضرات میں سے بیشتر نے قرآن مجید کے ذریعہ اسلام کی دریافت کی اور اس پر مطمئن ہو گئے اور اس کا ادراک بھی کر لیا مگر ان کے اسلام قبول کرنے کے بعد ان کے سامنے پورا اسلامی روایتی سرمایہ قرآن کے ایک متوازی نص کی حیثیت سے پیش کیا گیا اور دلیل یہ دی گئی کہ یہ قرآن وسنت کی شرح یا قرآنی اقدار اور سنت نبوی کا فہم ہے۔ یہاں آ کر انہیں پھر ان بہت ساری چیزوں سے سابقہ پیش آیا جن سے بچنے اور چھٹکارا حاصل کرنے ہی کی غرض سے وہ اپنے سابقہ مذاہب سے بھاگے تھے جیسے دوسری بت پرست اقوام وغیرہ کے روایتی سرمایوں کی تباہ کاریاں یا ان تاریخی زمانوں کی روایات جن کو انسانیت صدیوں پہلے خیرباد کہہ چکی ہے۔

## منہجی فہم اور نص اور کائنات کا جامع مطالعہ:

لہذا پیش آمدہ صورت حال پر قابو پانے کے لئے از سر نو قرآن کریم کی طرف ہماری واپسی کا تقاضا ہے کہ بیک وقت قرآن کریم اور صورت حال دونوں کا جامع فہم حاصل کیا جائے۔ یہی وہ ''منہجی فہم'' ہے جو موجودہ دور کے ''اسلام پسندوں اور مسلمانوں کی فکر اور ان کے عمل میں سب سے زیادہ مفقود ہے''، کیونکہ ان سب لوگوں نے اس منہجی فہم کو چھوڑ کر اور لمحہ بہ لمحہ تبدیل ہوتے حالات کے ادراک سے الگ تھلگ ہو کر ''جمود پرستی'' کی راہ اختیار کر لی ہے۔ اسی طرح ان کا رجحان نص کو اس کے کلی تناظر میں اور اس کی اساسی وحدت کے ساتھ پڑھنے اور بیک وقت نص اور کائنات دونوں کا جامع مطالعہ کرنے کے بجائے ''نص کی تجزی'' اور اس کو مختلف اجزاء میں تقسیم کرنے کی طرف ہے۔

ہم شدت کے ساتھ اس بات کے ضرورت مند ہیں کہ قرآن کے کلی تناظر میں اس کے

مطالعہ کا ایک ایسا نہج سیکھیں جو کائنات طبیعی کے کلی تناظر میں اس کے مطالعہ کے ساتھ پوری طرح ہم آہنگ اور اس کے مشابہ ہو۔ کیونکہ ایسی طبیعی آیات بکھری پڑی ہیں جن کے منہج تک رسائی حاصل کرنے کے لئے عقل ان کے کلی نظام اور ان کے باہمی ربط کے اصولوں سے پردہ اٹھاتی ہے۔ یہی معاملہ قرآنی آیات کے ساتھ بھی ہے۔ عقل ان کے کلی نظام اور ان کی منہجی نامیاتی وحدت کی بھی دریافت کرتی ہے۔ غالباً اسی سے اس امر کی وضاحت بھی ہوجاتی ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ نے کیوں اللہ تعالی کے حکم سے توفیقی طور پر قرآنی آیات کی نئی ترتیب قائم فرمائی۔ یہ نئی ترتیب اس لئے قائم کی گئی تھی تا کہ یہ کتاب اپنی منہجی پوزیشن حاصل کرلے: ''**واذا بدلنا آية مكان آية والله أعلم بما ينزل قالوا إنما أنت مفتر بل أكثرهم لا يعلمون قل نزله روح القدس من ربك بالحق ليثبت الذين آمنوا وهدى وبشرى للمسلمين**'' (سورۂ نحل: ۱۰۱-۱۰۲) (اور جب ہم کسی آیت کو دوسری آیت کی جگہ بھیج دیتے ہیں اور اللہ ہی بہتر جانتا ہے جو کچھ وہ بھیجتا رہتا ہے، تو یہ لوگ کہنے لگتے ہیں کہ تم تو نرے گھڑ لینے والے ہو، نہیں بلکہ ان میں سے زیادہ تر بے علم ہیں۔ آپ کہہ دیجئے کہ اسے روح القدس نے آپ کے پروردگار کے پاس سے حکمت کے موافق اتارا ہے تا کہ ایمان والوں کو ثابت قدم رکھے اور مسلمانوں کے حق میں ہدایت و بشارت بن جائے)۔

ثابت قدمی اور استقامت عطا کرنا حالات وظروف کے ساتھ مخصوص ایک صورت حال ہے، جس کا مقصد نازک صورت حال کی حساسیت پر قابو پانا ہوتا ہے۔ اسی سے اس بات کا بھی اشارہ ملتا ہے کہ قرآنی آیات کا نزول اسباب سے مربوط ہے، البتہ یہ اسباب بنیادی طور پر نزول آیات کے موجب نہیں ہیں۔ قرآنی اسلوب میں بشارت مستقبل ہی سے متعلق ہوتی ہے۔ اسی لئے ازسرنو ترتیب قائم کی گئی تا کہ قرآن مجید کو اس کی کلی منہجی وحدت حاصل ہوسکے اور قرآن کریم نیز اس سے رجوع کرنے اور اس کو ماخذ بنانے کے تقاضے انسانی عقل کے ارتقاء کے ساتھ

ہم آہنگ ہوسکیں اوراس طرح ایک ایسی منہجی وحدت روبہ عمل لائی جاسکے جس کا مقصد یہ ہو کہ قرآنی آیات پران کے کلی مجموعہ اوران کی تحریک کومنضبط کرنے والے عناصر کی روشنی میں غور وفکر کیاجائے، خواہ یہ غور وتدبر کتاب اللہ کی آیات میں کیاجائے یا کتاب فطرت کی آیات میں:"وآية لهم الليل نسلخ منه النهار فإذا هم مظلمون والشمس تجري لسمتقر لها ذلک تقدير العزيز العليم والقمر قدرناه منازل حتى عاد كالعرجون القديم لاالشمس ينبغي لها أن تدرک القمر ولا الليل سابق النهار وكل في فلک يسبحون" (یس:۳۷-۴۰)(اورایک نشانی ان لوگوں کے لئے رات بھی ہے، ہم اس پر سے دن کواتار لیتے ہیں۔سو یکا یک لوگ اندھیرے میں رہ جاتے ہیں اورایک نشانی آفتاب بھی ہے کہ اپنے ٹھکانے کی طرف چلتا رہتا ہے۔یہ اندازہ ٹھہرایا ہوا ہے زبردست علم والے خدا کااورایک نشانی چاند بھی کہ ہم نے اس کے لئے منزلیں مقرر کی ہیں یہاں تک کہ وہ ایسا رہ جاتا ہے جیسے کھجور کی پرانی ٹہنی۔نہ آفتاب کی مجال ہے کہ چاند کوجا پکڑے اورنہ رات دن سے پہلے آسکتی ہے اورسب ایک ایک دائرہ میں تیر رہے ہیں)۔

قرآن کے کلی مجموعہ سے تمام کائناتی مظاہر خواہ وہ بڑے ہوں یا چھوٹے، سب کے سب منضبط ہوجاتے ہیں۔کائناتی مظاہر کا حال یہ ہے کہ ان کا ایک چھوٹا سا ذرہ بھی فلک کے بغیر نہیں ہے۔اس انضباط کا مظہر اس وقت سامنے آتا ہے جب کائنات کے جزئیات اپنے محور کے گردگردش کرتے نظر آتے ہیں۔

یہی وہ مقام ہے جہاں سے ہمیں اپنے فکری مسائل اوران پر مرتب ہونے والے اثرات سے باہر آنے کی سمت میں اپنے سفر کا آغاز کرنا چاہئے تاکہ ہم "کتاب کریم" سے جواپنی منہجی وحدت میں مطلق ہے، اپنے منہجی ربط کوبحال کرسکیں۔کتاب الٰہی کی اطلاقیت یہ ہے کہ وہ تعداد کے اعتبار سے محدود وحی الٰہی کے ذریعہ اس کائنات کا احاطہ کرتی ہے جواپنے جزئیات میں

لامحدود ہے۔اس طرح اس کا مطلق اضافی کو محیط ہوتا ہے۔کیونکہ یہ وہ وحی الٰہی ہے جس کی حکمرانی اور بالادستی ہر دور پر ہے:"**والذي أوحينا إليک من الكتاب هو الحق مصدقا لما بين يديه إن الله بعباده لخبير بصير، ثم أورثنا الكتاب الذي اصطفينا من عبادنا فمنهم ظالم لنفسه ومنهم مقتصد ومنهم سابق بالخيرات بإذن الله ذلک هو الفضل الكبير**"(فاطر:۳۱-۳۲)(اور جو کتاب ہم نے آپ کے پاس بھیجی ہے وہ بالکل ٹھیک ہے جو اپنے سے پہلی کتابوں کی بھی تصدیق کرتی ہے۔بے شک اللہ اپنے بندوں کی پوری خبر رکھنے والا خوب دیکھنے والا ہے، پھر ہم نے یہ کتاب ان لوگوں کے ہاتھ میں بھی پہنچائی جنہیں ہم نے اپنے بندوں میں سے چن لیا، پھر ان میں سے بعض تو اپنے نفس پر ظلم کرنے والے ہیں اور بعض ان میں سے متوسط ہیں اور بعض ان میں سے اللہ کی توفیق سے نیکیوں میں ترقی کئے چلے جاتے ہیں۔یہ بہت ہی بڑا فضل ہے)۔اب خاتم الانبیاء والمرسلین کے بعد نہ کوئی معصوم رہا، نہ قرآن کے بعد کوئی کتاب مطلق رہی۔رسالت نے توضیح وتشریح کے اعتبار سے ہر چیز کا احاطہ کرلیا ہے۔اب لوگ یا تو اس کی حدود سے تجاوز کر کے اپنے اوپر ظلم کرنے والے ہوں گے یا اس کے ساتھ تعامل کر کے اعتدال کی راہ اختیار کرنے والے یا ان نیکیوں کی طرف سبقت کرنے والے جن کی طرف اللہ تعالیٰ کے حکم سے رہنمائی کی گئی ہے۔

اس نتیجہ تک پہنچنے کے لئے جس سے ہم قرآن وسنت کے ساتھ اپنے منہجی تعامل کا آغاز کریں گے، یہ ضروری ہے کہ ہماری بنیادی خود قرآن کے ذریعہ طبیعی اور انسانی علوم کے مناہج کے اسلامائزیشن پر ہو، تاکہ ہم اس اسلامائزیشن سے قرآن کے منہجی فہم کی راہیں نکالیں۔ اسلامائزیشن ایک ایسا دوطرفہ عمل ہے جس میں اثرات کا باہم تبادلہ ہوتا ہے، کیونکہ قرآن علم کے مناہج کی قدر پیمائی کرتا ہے۔ان کے رخ کو درست کرتا ہے۔ان کی تصدیق کرتا ہے اور ان پر اپنی بالادستی قائم کرتا ہے۔دوسری طرف اس کے اصلاح کردہ علمی مناہج مزید گہرائی کے ساتھ

قرآن کی وسیع دنیا میں قدم رکھنے میں معاون ہوتے ہیں۔ یہ مناہج قرآن کے بہتر فہم میں مدد کرتے ہیں اور یہ اسی صورت میں ہوسکتا ہے جب ''دو مطالعے'' یعنی ربانی اور قلمی یا غیبی اور معروضی، ایک ساتھ جمع ہوجائیں، بالفاظ دیگر ایک طرف وحی الٰہی کا مطالعہ ہو اور دوسری طرف کائنات کا مطالعہ ہو جیسا کہ اللہ تعالی نے ہمیں قرآن کی اول اول نازل ہونے والی آیات میں حکم دیتے ہوئے فرمایا:''**اقرأ باسم ربک الذي خلق، خلق الإنسان من علق، اقرأ وربک الأکرم الذي علم بالقلم علم الإنسان مالم یعلم**'' (علق:۱-۵)(آپ پڑھئے اپنے پروردگار کے نام کے ساتھ جس نے سب کو پیدا کیا ہے۔جس نے انسان کو خون کے لوتھڑے سے پیدا کیا ہے۔آپ پڑھئے اور آپ کا پروردگار بڑا کریم ہے جس نے قلم کے ذریعہ سے تعلیم دی ہے، جس نے انسان کو ان چیزوں کی تعلیم دی جنہیں وہ نہیں جانتا تھا)۔

چنانچہ ایک طرف وحی الٰہی کی آیات اور دوسری طرف آیات فطرت کے جامع مطالعہ ہی کی روشنی میں ''باہمی تعامل اور تغیر احوال'' کے مختلف ایسے عناصر اور پہلو واضح ہوں گے جو انسان کی اسلامی فکر کے اندر سے ہر قسم کی جمود پرستی کا خاتمہ کردیں گے۔یہ جمود پرستی کائنات کے قوانین اور لحہ بہ لحہ پیش آنے والے ان تغیرات کے نقطہ نظر کو ملحوظ نہیں رکھتی ہے جن کی طرف پیش تر قرآنی آیات رہنمائی کرتی ہیں:''**تولج اللیل في النهار و تولج النهار في اللیل و تخرج الحي من المیت وتخرج المیت من الحي وترزق من تشاء بغیر حساب**''(آل عمران:۲۷)(تو رات کو دن میں داخل کرتا ہے اور رات میں دن کو داخل کرتا ہے اور تو بے جان سے جاندار کو نکالتا ہے اور تو جاندار سے بے جان کو نکالتا ہے اور تو جسے چاہتا ہے بے حساب رزق دیتا ہے)۔

اس طرح ربانی اور انسانی قلمی ''مطالعوں کی جامعیت'' نیز تغیر احوال اور ہم آہنگی پر زور اور نت نئی تبدیلیوں کی تاریخی منطق کی توثیق ہمیں ایک واضح منہجیت کے ساتھ قرآن کریم کی

دنیا میں لے جائے گی۔اس منہجیت کے ذریعہ ہم ان مسائل کے سمندر کو عبور کر سکنے کی پوزیشن میں ہوں گے جن کو اب تک تطبیق و تلفیق کی منطق سے حل کرنے کی کوششیں کی جاتی رہیں ہیں۔ان ہی مسائل نے ابن رشد کو "**فصل المقال فیما بین الحکمة والشریعة من اتصال**" لکھنے پر آمادہ کیا۔اس کے باوجود اب تک فلسفہ اور شریعت کے درمیان وہ ربط قائم نہ ہو سکا جن پر ابن رشد نے کام کیا تھا۔ان ہی مسائل کے پیش نظر امام غزالیؒ نے "**تھافت الفلاسفة**" میں فلسفہ پر تنقید کی یا ابن الصلاح نے منطق کو حرام قرار دیا یا ابن تیمیہ نے "عقل و نقل" کے تعارض کو دور کرنے کے لئے فن منطق میں "حد اوسط" کی تعریف کو قرآن کی ایک "حد" سے بدلنے کی کوشش کی لیکن یہ تمام تر کوششیں منطق و فلسفہ سے وابستہ افراد کو جو بزعم خویش علم کے وارث ہیں، اس قائل بنانے میں ناکام رہیں کہ وہ عقل کا محض احترام ہی کر لیں۔لہذا محض جزوی فقہ یا کسی علم یا آیات قرآنی کے انتخاب سے اخذ کردہ چند مسائل کی بجائے پورے قرآن کو بنیاد بنا کر جہاد کرنا ضروری ہے۔

یہ مطلوب نہیں ہے کہ اسلامی جزئیات سے ہٹ کر ردعمل یا دفاع کی مختلف اقسام کے ذریعہ جہاد کیا جائے یا محض چند متعین شبہات کے جواب پر اکتفا کیا جائے بلکہ مطلوب یہ ہے کہ ان تمام چیزوں کے ساتھ ساتھ "قرآن کی علمی منہجیت" کے ساتھ جہاد کیا جائے۔کیونکہ موجودہ علوم کے تمام مناہج خواہ وہ "علمی جدلیت" کی صورت میں پائے جائیں یا "اضافیت" اور "امکانیت" پر مبنی "منطقی وضعیت" کی صورت میں۔اسی طرح تمام عالمی تہذیبی نظاموں کے مسائل اور ان سے پیدا شدہ آویزشیں اور کش مکش، یہ سب کے سب بالآخر ایک ہی مسئلہ پر جا کر ٹھہر جاتے ہیں یعنی انتشار کی وہ کیفیت جس سے علوم کے مناہج اور تہذیبوں کے تمام نظام گذر رہے ہیں۔اسی طرح موجودہ دور کی مغربی تہذیب میں کائنات کے انضباطی عوامل سے روشنی حاصل کرنے والے "ربط و تسلسل" کی اہلیت کا فقدان جب کہ قرآن نے ان کو ہر سطح پر تفصیل

سے بیان کیا ہے۔

اس انتشار کا اور علمی وتہذیبی سطح پر ربط وتسلسل سے قاصر رہنے کا نتیجہ اس صورت میں برآمد ہوا کہ وہ سیکولر لبرل انفرادیت پسندی مستحکم ہوگئی جو انسان کو رسولوں کے عہد سے قبل کی صورت حال کی طرف لے جانا چاہتی ہے جب انسان روئے زمین پر فساد مچاتا تھا، خوں ریزی کرتا تھا اور کھیتی اور نسل کو تباہ کرتا تھا حالانکہ اللہ تعالی کو یہ حرکتیں پسند نہیں ہیں۔

لہذا ہمیں اپنی جدوجہد کا آغاز قرآن کی منہجیت کو اساس بنا کر کرنا چاہئے نہ کہ موجودہ انسانی علوم ومعارف کو مسترد کر کے یا ان کو نظر انداز کر کے یا نئے علوم کی تشکیل اور نئے تہذیبی نظاموں کی تعمیر کی مخالفت کر کے۔ ہم تمام اہل علم کو اس بات کی دعوت دیں کہ وہ قرآنی منہج کے مطابق فلسفہ علوم کی تشکیل نو کریں اور انتہائی غیر جانب دارانہ انداز میں عالمی تہذیبی نظاموں کی رہنمائی کریں۔ اللہ تعالی کے حکم سے یہ رہنمائی طبیعی علوم کو جزئی اور غیر مربوط علوم کی موجودہ صورت حال سے نکال کر انہیں کائناتی اور مربوط علوم میں تبدیل کرنے کا ذریعہ بنے گی۔ یہ کائناتی اور مربوط علوم پوری کائنات کے طبیعی اور انسانی دونوں مظاہر سے متعلق اور ہم آہنگ ہوں گے۔ ان علوم سے یہ بھی معلوم ہو سکے گا کہ ان مظاہر کا ذات خداوندی سے کیا ربط ہے؟ یہ علوم صرف ان معانی پر موقوف نہیں ہیں جن کا اظہار وضعی یا محدود معروضی بحث وتحقیق کے ذرائع، وسائل اور مناہج کے ذریعہ ہوتا ہے۔ اس لئے کہ انسان کے اندر ادراک کی اور دوسروں پر نفسیاتی یہاں تک کہ طبیعی اثر ڈالنے کی غیر معمولی قوتیں ہیں۔ اسی طرح فطرت کے اندر تاثیر وتاثر اور انقلاب احوال کی توانائیاں موجود ہیں۔ یہ دو حدوں کے مابین ہیں، نہ بہت زیادہ بڑی نہ بہت زیادہ چھوٹی: "إن الذين يجادلون في آيات الله بغير سلطان أتٰهم، إن في صدورهم إلا كبر ماهم ببالغيه فاستعذ بالله إنه هو السميع البصير، لخلق السماوات والأرض أكبر من خلق الناس ولكن أكثر الناس لا يعلمون" (غافر:٥٦-٥٧)(جو لوگ جھگڑے

نکالتے رہتے ہیں اللہ کی آیتوں میں بغیر اس کے کہ کوئی سندان کے پاس موجود ہو۔ان کے دلوں میں نری بڑائی (ہی بسی ہوئی) ہے کہ وہ اس تک پہنچنے والے نہیں۔سو آپ اللہ کی پناہ مانگتے رہئے۔بے شک وہی سب سننے والا ہے سب دیکھنے والا ہے۔آسمانوں اور زمین کا پیدا کرنا آدمیوں کے پیدا کرنے سے یقیناً بڑھ کر (کام) ہے لیکن اکثر آدمی نہیں سمجھتے)۔

لہذا قرآن کی علمی منہجیت علمی اور تطبیقی سطح پر براہ راست محققین کو طبیعی یا انسانی مظاہر کے جزوی نقد و جائزہ کے دائرہ سے نکال کر ان کائناتی تجزیوں کے رخ پر ڈالے گی، جن کے اندرون میں خود اس کی تشکیل ہوئی ہے۔مثلاً ''شی کو وجود بخشنے اور اس کا دائرہ عمل متعین کرنے'' سے متعلق موجودہ علمی اصول کسی بھی مظہر کی اس کے کائناتی دائرہ میں تحقیق سے قاصر ہیں، چنانچہ ان کے اندر اس غیر محدود جدلیت کا فقدان ہے جو تخلیق کے تسلسل، اس کی تاثیر و تاثر کی کیفیت اور اس کے تغیر میں پائی جاتی ہے جس کا مظہر زندہ کو مردہ سے نکالنا، مردہ کو زندہ سے نکالنا اور پانی اور مٹی کے دو مرکبات سے پیدا شدہ تنوع ہے۔اسی طرح پیاس بجھانے والے میٹھے پانی اور حلق چھیل دینے والے سخت کھارے پانی جیسے دو مختلف اشیاء سے پیدا شدہ وحدت بھی اس کا مظہر ہے۔ان کی ماہیت میں اختلاف کے باوجود انسان کو ان دونوں سے تر و تازہ گوشت حاصل ہوتا ہے۔

## قرآن کی منہجیت:

بلاشبہ قرآن کی منہجیت ہی ''موجودہ علم کے مسائل'' کا حل ہے۔اسی سے اس کی منہجی تحقیقات کو فروغ ملے گا اور وہ اس قابل ہو سکیں گی کہ طبیعی علوم کے فلسفہ کا ایک ایسا نیا کائناتی تصور پیش کریں جو علم کی روشنی میں عقیدہ توحید سے مربوط ہو جہاں پہنچ کر آیت: ''**إنما يخشى الله من عباده العلماء**'' (فاطر:۲۸) (اللہ سے تو صرف وہی بندے ڈرتے ہیں جو علم والے ہیں) کا سرچشمہ معلوم ہو جائے اور اس کا مفہوم واضح ہو جائے۔

قرآن کی منہجیت صرف طبیعی مظاہر کے اس مطالعہ تک محدود نہیں ہے جو قرآن سے اپنے کائناتی اشارات اخذ کرے بلکہ اس کا دائرہ تحقیق ان انسانی مظاہر تک وسیع ہے جو طبیعی مظاہر سے ہم آہنگ ہیں۔

اگر موجودہ علم اس کائناتی دائرہ میں بحث وتحقیق سے گریز کرتا ہے یا پیچیدہ مظاہر پر غور وفکر سے پہلو تہی کرتا ہے تو ایسی صورت میں "قرآنی منہجیت" کا فرض ہوگا کہ وہ اہل علم اور بیدار مغز مسلمان محققین کی کاوشوں کے ذریعہ اس رکاوٹ کو دور کرے۔ اس طرح ہم علمی طریقہ پر اور تہذیبی نظام کے دائرہ میں انسانیت تک رسائی حاصل کرسکیں گے۔

یہ دین ایک مطلق منہجی کتاب اور ایک ہمہ گیر عالم گیر پیغام پر مبنی ہے، چونکہ ہم نے اپنی منہجیت اور اپنے علوم کو دوسروں تک منتقل کرنے میں کوتاہی کی، اس لئے دوسروں کے لئے یہ میدان کھلا رہا اور انہیں اس کا پورا موقع ملا کہ وہ اس خلا کو اپنے نظام سمیت اپنی منہجیت اور اپنے علوم سے پر کردیں اور ہم اس بات کے لئے مجبور کردیئے گئے کہ اپنا توحیدی عمرانی نظام چھوڑ کر ان کا نظام اختیار کرلیں یہاں تک کہ عالم گیر تہذیبی سطح پر ان کی بالادستی اس طرح قائم ہوگئی کہ آج سب کے سب اسے جھیل رہے ہیں۔ ہمارا فرض ہے کہ ہم اپنی شخصیت اور اپنے وجود کی دریافت کریں اور ان نعمتوں، عالمی ذرائع ووسائل اور قرآنی منہجیت کا شعور حاصل کریں جن سے اللہ تعالی نے ہمیں نوازا ہے۔ ہمیں عطا کئے گئے عالمی وسائل اور قرآنی منہجیت میں سے کوئی بھی اسباب کا روادار نہیں کہ ہم اپنی ذات کے خول میں بند ہوجائیں یا شہادت علی الناس کے فریضہ سے پہلو تہی کرلیں۔

## اجتماعی اجتہاد اور اجتماعی عمل:

مصلحین کی ایک تعداد تو وہ ہے جس نے تفسیر کو اپنا موضوع بنایا۔ اس کو اسرائیلیات، افسانوں اور خرافات سے پاک کیا۔ یہ ایک ضروری کوشش تھی۔ کچھ لوگوں نے سیاسی استبداد کے رجحانات کا موضوع منتخب کیا اور بعض نے اصولی حکمرانی پر بحث کی۔ یہ تمام کی تمام کوششیں

مطلوب ہیں۔ان ہی میں ہمیں مصلحین کی ایک ایسی تعداد بھی نظر آتی ہے جن کی عمومی کوششوں سے ہم مختلف موضوعات پر مختلف زمانوں میں استفادہ کر سکتے ہیں۔

لیکن ان افراد کی ایک بڑی جماعت نے جن کی تحقیقات اور فکری کاوشیں خود فکری ڈھانچہ کی اصلاح کی طرف رہنمائی کرتی ہیں، اب تک مسلمانوں کے فکری طریقوں کو موضوع بحث نہیں بنایا ہے۔میری مراد ان افراد سے ہے جو علوم لغت، سماجیات اور تاریخ کے مناہج اور عہد تدوین کے مختلف مسائل کی بحث و تحقیق کرتے رہتے ہیں۔مسلمانوں کے طرز عمل کی اصلاح پر ان اسکالرس نے بھی قلم نہیں اٹھائے ہیں جو علمی طریقہ پر موجودہ علوم کے مناہج سے متعلق مسائل پر غور وفکر کرتے رہتے ہیں۔

اسی سے اس رائے کی اہمیت بھی ظاہر ہوتی ہے کہ ''اجتماعی اجتہاد'' ضروری ہے، اس تصور کی حیثیت سے نہیں جس میں یہ فرض کرلیا جائے کہ اہل تحقیق کی ادراک واستنباط کی انفرادی صلاحیتیں اور خوبیاں مہمل ہیں، کیونکہ ہر ایک کو اپنے مقصد وجود کی تکمیل کا موقع ضرور میسر آتا ہے، بلکہ ایک ایسے تصور کی حیثیت سے جو علمی تحقیق کی تمام شاخوں کی وحدت پر مبنی ہو اور انسانی وطبیعی مظاہر پر بحث وتحقیق کے کلی تناظر میں ہو۔چنانچہ لغت کا ایک محقق جو نصوص کی دلالت پر عبور رکھتا ہو اور مختلف تاریخی مراحل میں ان کے استعمالات پر اس کی گہری نظر ہو، اجتہاد کی اجتماعی حیثیت کو مالا مال کر سکتا ہے اور اس میں بیش قیمت اضافہ کر سکتا ہے۔اسی طرح علم انسانیات کا ایک محقق ان معاشروں کی ثقافتوں پر داد تحقیق دے کر اس دھارے کو تقویت پہنچا سکتا ہے جن کا ذریعہ معاش کھیتی کرنا اور جانوروں کا چرانا ہوا کرتا تھا۔اگر موضوع اقوام وملل اور مردہ تہذیبوں کے تجربات کی تحقیق سے متعلق ہو تو ان ہی حضرات کے شانہ بشانہ تاریخ اور علم آثار کے ماہرین اور دیگر اہل اختصاص بھی اپنا کردار ادا کر سکتے ہیں۔

منہجیت کے کلی اصولی کا تقاضا ہے کہ ایک معروضی صورت حال کے جائزہ میں تحقیقات اور تجزیوں کا تنوع سامنے آئے اور ان میں وحدت بھی ہو، نص کے اشارات کے سمجھنے میں سطح کا اختلاف ہو اور ایسے ناقدانہ تجزیاتی اسلوب میں روایتی سرمایہ پر نظر ثانی کی جائے کہ اس کا داخلی مضمون خود معانی و مفاہیم پر دلالت کرے۔اس طرح ہمیں امید ہے کہ ہماری کوششیں ایک ایسے چینل کی شکل اختیار کریں

گی جس سے مختلف اور متنوع علمی کوششوں میں باہم ربط پیدا ہو سکے گا اور وہ ایک دوسرے سے ہم آہنگ ہوسکیں گی۔اس کا اجتماعی ثمرہ سب سے پہلے مختلف علمی شعبوں میں وحی الٰہی پر مبنی قرآنی نظریہ کی عملی تعبیر کی صورت میں ظاہر ہوگا جیسے قرآنی منہجیت اور وحی و کائنات کے مذکورالصدر جامع مطالعہ کے ذریعہ نفسیات، اقتصادیات، سماجیات اور طبیعی علوم کا اسلامائزیشن۔قرآن اور قرآنی منہج کے ذریعہ ان علوم و مناہج کے اسلامائزیشن کا اور اس کے ذریعہ قرآن تک رسائی حاصل کرنے کا نتیجہ اس صورت میں ظاہر ہوگا کہ وحی الٰہی سے علوم کی مشکلات و مسائل کا حل نکل آئے گا اور ان علمی عناصر کی روشنی میں اور ان کو ملحوظ رکھ کر نصوص سے استفادہ کرنے والے ان کا بہتر فہم و ادراک کرسکیں گے۔

لہٰذا طرز فکر کی اصلاح تمام علمی کاموں کی درستگی کی تمہید ہے۔یہ ضروری نہیں کہ علمی کاموں کا کردار بار بار ان ہی اساسی اصولوں پر غور و فکر کرنے تک محدود رہے جن کو بنیاد بنا کر متقدمین کتاب و سنت اور اجتہاد کے ضابطوں پر گفتگو کرتے آئے ہیں۔آج ان ضابطوں کی صورت حال یہ ہے کہ انسان کے طریقہ ادراک سے متعلق وسائل بحث و تحقیق اور علمی مناہج میں تبدیلی آجانے کی وجہ سے خود ان میں بہت کچھ تغیر واقع ہو چکا ہے، کیونکہ کچھ لوگوں کو چیزوں کا ادراک ان کی تعداد کے ذریعہ ہوتا ہے، کچھ کو بالمقابل اشیاء کے ذریعہ، کچھ لوگ امور کا ادراک ان کی جامع وحدت کی صورت میں کرتے ہیں، کچھ لوگ بیانیہ اسلوب میں مسائل کو زیر بحث لاتے ہیں اور کچھ لوگ علمی اور تجزیاتی اسلوب میں مسائل پر بحث کرتے ہیں۔

صورت حال اور مناہج علم کے ہر مجموعہ کو محیط یہ "اجتماعی اجتہاد" ہمارے اندر اس شعور کا تناسب گھٹا دیتا ہے کہ جزوی کوششوں سے اصلاح ممکن ہے مثلاً ایک بے حد پیچیدہ اور گڈمڈ صورت حال میں اقتصادی مسائل کا حل یا بعض سماجی مسائل کا حل یا اصلاح کے عمل کو انفرادی عمل میں تبدیل کرنا۔

اجتماعی عمل کی سطح پر اور فکری تناظر میں اگرچہ ہمارے تجربات اب بھی محدود ہیں مگر ان کے ذریعہ ہمیں وضاحت کے ساتھ یہ معلوم ہو چکا ہے کہ مسئلہ کتنا سنگین، دوررس اور گہرا ہے اور ان کے نتیجہ میں ہمیں اس بات کا بہت زیادہ یقین ہونے لگا ہے کہ پیچیدہ علاقائی، ریاستی اور بین الاقوامی پس منظر اور ایک بدلتے عالم گیر تہذیبی تناظر میں امت مسلمہ کی فکری اور ثقافتی صورت حال کو بدلنے نیز سیاسی، فکری،

سماجی اور اقتصادی سطح پر اس صورت حال کی اساس میں تبدیلی لانے کے لئے بڑے پیمانے پر اجتماعی اجتہاد اور محنت وکاوش ضروری ہے۔

## تصورات سے متعلق مسائل:

دنیا کی موجودہ صورت حال میں ضروری ہے کہ ہماری امت کا ہر مسئلہ سب سے پہلے ''قرآن کے بنیادی ڈھانچہ'' کی روشنی میں حل ہو، کیونکہ ''قرآن ہر چیز کی تشریح ہے''، قرآن کے بعد فہم، بیان اور تطبیق میں ''سنت نبوی کے کلی منہج'' کا درجہ ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ آج ہمارے جن تصورات کو'' گلوبلائزیشن'' ایک ایک کر کے اچکتا چلا جا رہا ہے اور انہیں مٹا دینے کے لئے کوشاں ہے، ان کی اہمیت اور ان کے باہمی ربط کو قرآن کے ذریعہ نمایاں کیا جائے۔ ان ہی میں سے ایک تصور ''جہاد'' بھی ہے۔ یہ تصور بھی قرآن کے دیگر تمام تصورات کی طرح ایک شاہ کار ہے۔ یہ اتنا وسیع ہے کہ اس کے اندر معانی، مبادیات، وسائل وذرائع، درجات اور معیارات کا ایک پورا شہرستان پنہاں ہے، یہاں تک کہ یہ اپنی وسعت اور ہمہ گیری میں قریب قریب ایمان کے مساوی ہے اور اگر حدیث شریف کے مطابق ایمان کے ستر سے زائد درجے ہیں تو جہاد کے درجے بھی اس سے کچھ کم نہیں ہیں۔

یہ قرآنی نقطہ نظر سے اتنا وسیع ہے کہ خاندان، معاشرہ، حکومت اور فرد ہر ایک سے متعلق انسانی سلوک کو محیط ہے۔ بعض تحریروں اور افکار میں اسے اتنا محدود کر دیا گیا ہے کہ یہ قتال (جنگ) کا مترادف ہو گیا ہے۔ تصور'' جہاد'' کی اسی وسعت وہمہ گیری کی وجہ سے اسے ایک محکم فریضہ اور قیامت تک باقی رہنے والی سنت قرار دیا گیا ہے۔ یہ ایک ایسا فریضہ اور ایک ایسی سنت ہے کہ زندگی کا اس کی بعض اقسام اور اس کے بعض مراتب سے خالی ہونا ممکن نہیں، خواہ حالات کیسے ہی ہوں اور ان میں کتنی ہی تبدیلیاں آ چکی ہوں۔ یہ محض جنگ اور صلح تک محدود نہیں ہے، کیونکہ ہر حال میں قائم ودائم رہنے والی چیز ہے۔ یہ ایک ایسا تصور ہے جو مقاصد شریعت اور انسان کی زندگی پر حکمرانی کرنے والی اسلام کی مندرجہ ذیل اعلی اقدار سے پوری طرح ہم آہنگ ہے: ۱-توحید، ۲-تزکیہ، ۳-تعمیر

چنانچہ انسان کا ہر وہ ارادہ یا نیت یا فکر یا اعتقاد یا قول یا عمل یا منصوبہ جس کا مقصد ان اعلی

اقدار یا عظیم تر مقاصد کو مستحکم کرنا ہو" جہاد" ہے۔اسی لئے کبھی بھی اس کا اطلاق کسی قوم یا حکومت یا ملک یا سیاسی گروہ کی شخصی بالادستی کی صورتوں پر نہیں ہوسکتا۔دوسرے الفاظ میں شریعت کے دیگر وہ تمام مقاصد جو ان اعلیٰ اقدار سے متفرع ہیں یا ان کے ذیل میں آتے ہیں، وہ اپنے وجود، اپنی تکمیل، اپنے استحکام یا اپنے تحفظ میں "جہاد" کی کسی نہ کسی قسم پر موقوف ہیں۔

بین الاقوامی اسلامی تعلقات میں اصل کیا ہے؟ جنگ یا امن، قتال یا صلح؟ اس سلسلہ میں ماضی سے لے کر حال تک میں جو بحثیں ہوتی رہی ہیں وہ غیر اہم معلوم ہوتی ہیں، کیونکہ جنگ اور صلح دونوں ہی زندگی کی "جدلیت" کے دائرہ میں گھومنے والی اسی طرح کی دو کیفیات ہیں جیسے صحت اور مرض۔

جہاد ان دونوں کیفیتوں کو محیط ہے اور ان کی حدود سے بالاتر ہے۔فقہاء نے جو ہر چیز میں اصل کے تعین کا التزام کیا ہے، یہ دراصل فن فقہ کا ایک تقاضا ہے، لہذا علمی بحث وتحقیق میں ایک اساس کی حیثیت سے اس کا تعین لازمی ہے۔اسی لئے اصل اور غیر اصل کی تعیین کو "شریعت کی حکمراں اقدار" نیز ان پر مبنی اور ان سے مستفاد اقدار سے مربوط ہونا چاہئے۔اسی طرح اس تعیین کو قرآنی منہجی اصولیات جیسے "پیغام اسلامی کی عالم گیریت"، "کتاب اللہ کی حاکمیت"، "نبوت کی تکمیل" اور "آسانی وہمدردی پر مبنی شریعت" سے ہم آہنگ ہونا چاہئے، کیونکہ عمل تعمیر کے میدان کی حیثیت سے پوری روئے زمین ایک ہے اور سارے انسان اس لحاظ سے کہ وہ اس عمل تعمیر کو سرانجام دینے کے لئے روئے زمین پر اللہ کے خلیفہ بنائے گئے ہیں، ایک ہیں۔اب اس کے بعد روئے زمین دو حصوں میں تقسیم ہوجائے گی: ایک "دار اجابت" اور دوسرے "دار دعوت"، لیکن یہ دونوں حصے رہیں گے "دار الاسلام" ہی۔اسی طرح سارے انسان بھی اس لحاظ سے کہ تعمیر کے بارے میں ان کا موقف کیا ہے اور ان میں شرائط تعمیر کے پائے جانے کا تناسب کیا ہے، دو قسموں میں تقسیم ہوجائیں گے: ایک "امت اجابت" اور دوسرے "امت دعوت"۔ان دونوں طبقات کے درمیان یک جہتی اور ہم آہنگی کی فضا عام ہوگی اور ایسی صورت میں "جہاد" یہ ہوگا کہ "دعوت" اور "اجابت" کے درمیان مسلسل تعاون پایا جائے اور بحث ومباحثہ کا سلسلہ بھی جاری رہے۔اسی طرح توحید، تزکیہ اور تعمیر کی صورت میں "شریعت کی حکمراں اقدار" اور اس کے "عظیم تر مقاصد" کو بروئے کار لانے کے لئے دونوں طبقوں کے درمیان دائمی حرکیت موجود رہے۔